

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224599

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP---556---13-7-71 ---4,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

۳۹۸ ۲۸۵۵۵

Accession No.

۲۸۳۶۴
۳۰۶۱

Author

دویندر سناری

Title

سی جون خانہ روشنی

This book should be returned on or before the date last marked below.

نہیں
ہوں
خانہ
بدوش

دیوندرستیا رتھی کی دیگر کتابیں —

پنجابی :

گدھا

دیوالبے ساری رات

دھرتی دیاں واجاں (نظیں)

گنگ پوٹن رافسانے

شائع ہونے والی کتابیں —

اُردو :

نئے دیوتا رافسانے

ہندی :

گائے جا ہندوستان !

سانپ اور آدمی رافسانے

انگریزی :

THE SINGING VOICE OF MOTHER INDIA

SONGS OF THE INDIAN PEOPLE

پنجابی :

تے ونجھلی وجدی رہی (نظیں)

گاؤندا کسان

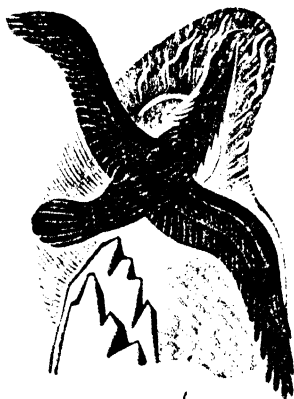
جنگلی کیبوتر



خانہ بدوش کنواری ناچتی ہے

بیکس ہٹول خانہ بدوش

از
دیوندر ستیا رتی



لاہور
پنج دریا
منبت روڈ

..... ظاہر ہے کہ پروفیسر دوبندر متیار کھٹی کو پچیس پروانہ فکر کی خدا داد قابلیت نصیب ہے۔ اسی کی بدولت سرود اپنا کام پوری توجہ اور ترقی دہی سے کر سکے ہیں کیونکہ اس کام میں انہوں نے حقیقی لکھنا محسوس کیا ہے۔
 عوام کے نفس کا تخلیقی ہیرو بھی ایک خاص دلچسپ المام لئے رہتا ہے۔ اسے پوری طرح سمجھنے میں پروفیسر متیار کھٹی نے ہماری مدد کی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں۔
 (ماڈرن ریویو، ستمبر ۱۹۶۲ء)
 دابندرانا تھریگور

..... شری دوبندر متیار کھٹی کی شاندار دھن کی بدولت میں ان صدوں کے پہاڑی گیتوں کے متنازعہ مجھے سے روشناس ہو سکا ہوں جن میں وہ گھومتے رہے ہیں۔ یہ گیت بہت عوام کا ادب ہیں۔ ہمارے صدوں کے دریا فی ملتوں سے لوگ جن سے کہ ان گیتوں کا تعلق ہے، ان سے بے بہرہ ہیں جیسے کہ غورِ تجربات میں بھی ہم لوگ عوام کے گیتوں سے کر رہے ہیں۔
 مٹر کے ایم منشی کے تجربات اور
 اُس کا ادب کے مقدر میں
 ایم کے گاندھی

U364

کاپی رائیٹ
 ۱۹۶۱ء

مصدقہ

پیشترنگو بالاس فیچر مرکز کٹائل پریس، ناہر

شہانتی سدرہا کے نام

جس کا ساتھ پچھلے بارہ سال کی خاندان بدوش میں
میری کٹھن منزلوں کو آسان کرتا رہا ہے۔

فہرست

۱۷	پہلی بات
۲۹	دھرتی کے بیٹے
۴۱	میری زندگی کا ایک ورق
۵۳	برہمچاری
۷۵	تین گیت
۸۹	سہرنی
۱۱۷	دیا بے ساری رات
۱۳۵	ایرادتی
۱۴۶	ماتونی
۱۶۹	ابھی کو تیا سسرال نہ جائے گی
۱۷۷	اپنی جورو کو سمجھا
۱۸۹	وہ کسان شہزادی
۲۰۷	لاچی
۲۲۳	میں ہوں خانہ بدوش
۲۳۷	لٹکا دیں ہے کو لمبیو
۲۵۵	جنگلی کیبوتر





فہم کے کہ فریادیں سنائی گئیں، وہ کہہ کیا دوا دے گا۔ یہ سب ہے، اس کی موت وہ پا لے گا، پھر پھر ہی لے گا۔ یہی کہتے ہیں کہ بزرگ آدمی انہوں نے یہی لکھ کر دیا ہے، وہام کے
 فحاشی ہو گی، کسی خاص شخص پر اس لئے ہے۔ اُسے پھر بھی یہ دیکھ کر سنا آتی ہے، یہی سنا ہے کہ یہاں سے وہاں آتا ہے۔
 مگر وہی پرویز، ستمبر ۱۹۸۳ء

رہنما لڑنا ہے، گھر

مقدمہ

تقریباً پانچ چھ سال ہوئے انشا پیدائش ہوئیوں کا زمانہ تھا۔ سر پہر کا وقت تھا۔ میں "المنظر" میں دیر اپنے کمرے میں میز پر کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ ایک لڑکے نے ایک چھوٹا سا پڑھ میرے ہاتھ میں لا کر دیا۔ اُس پر لکھا تھا: "دیوندر ستیا رتھی"۔ میں نے سوالی نظر سے لڑکے کی طوٹ دیکھا۔ وہ بولا: "جناب ایک لمبی داڑھی اور کھلے بالوں والا فقیر صورت آدمی ہے۔ فقیروں سے میری ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے لیکن پڑھے لکھے فقیروں سے کبھی کبھی مل لیتا ہوں میں۔ لے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ مجھے اس "فقیر" کی صورت پسند آئی۔ اوپر بلالیا۔ وہی لمبی داڑھی بڑی بڑی مونچھیں لمبے لمبے کھلے بال روشن آنکھیں بغل میں ایک رستہ دبانے رملیا قد اور اُس پر ایک لمبا ہی سا کوٹ پہنے بالوں ستیا رتھی صاحب اندر داخل ہوئے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک گھور نا آدمی میرے سامنے تھا۔ مجھے نہ انتی حکمتن یاد آگیا۔

ستیا رتھی صاحب نے نرم نرم باتیں کرنی شروع کیں اور اپنے بچے میں سے جب "ماڈرن بولی" اور "ایشیا" کے انگریزی پرچے نکالے اور ان میں اپنے بالقوہ رنگینوں والے مضمن مجھے دکھائے اور نئے نو میں نے بالکل تھپہرا ڈال دیئے۔ مجھ پر ان کا بہت رعب پڑ گیا میں انہیں اُس سے بھی اوپر کی منزل میں اپنی برساتی میں لے گیا میں نے لڑکے کو آواز دی: "چائے منگوئی" اور جی میں سوچا کہ آج کی شام ادنی عیش و عشرت میں گزارنی چاہئے۔ ایک حقیقت نگار دیکھ ملاقات ہو گئی اور وہ بھی باس شکل و صورت! اُس وزے کے کر۔ آج تک میں نے بہت کوشش کی ہے کہ ستیا رتھی صاحب کے مضامین کو تنقیدی نظر سے دیکھوں مگر سچ یہ ہے کہ کیا نہیں ہوا۔ نقص دیکھنے کی ابتدا ہوتی ہے کہ اُن کی وہ ہمکنی سنی سی آواز اُن کی وہ گھنی لمبی داڑھی اُن کی وہ ساری ہیئت کدائی یاد آجاتی ہے اور میں پھر اُن کی تحریر سے محض لطف اٹھانے لگتا ہوں۔ لیکن انصاف کی نظر سے دیکھتے تو اُن کی تحریر سے بھی پُر لطف۔ سیدھی سادھی طرز سیدھے سادھے خیالات پھر کس طرح جو کد ہے وہ دل میں جگ نہ پالے؟

ستیا رتھی صاحب کی عمر اس وقت ۳۲ سال کی ہے۔ جا بجا بالوں کی کثرت نے خواہ مخواہ بزرگ نشان پیدا کر دی ہے۔ یہ اٹھارہ سال کے تھے کہ معلوم کیوں انہوں نے خودکشی کرنے کی عثمان لی۔ ڈاکٹر بال زعم انہیں سمجھا کر لگی دنیا کے مفادات سے واپس ہوں لائے۔ بس واپس آتا تھا کہ بعد ازاں ایک جگہ

ہے سرے پاؤں میں زنجیر نہیں، آپ نے ہندوستان بھر میں گھومنا شروع کر دیا اور کہاں تو یہ کہ ساری دنیا سے میزبان تھے اور اب یہ حالت ہو گئی کہ اسی کو یہاں کے درختوں اور پرندوں اور سیلوں اور ہرنوں اور عورتوں اور کسانوں اور ان کے اٹھنے سیدھے گیتوں کے عاشق زاد ہو گئے۔ گھڑیں چہاں نصیب نہیں۔ بلکہ اول اول تو یوں بھلا کر جیسے میں یہ نہیں تو یہ بھلا ہی ہیں کاسر ہو رہا ہے۔ پھر گھر والوں نے ہوی کی زنجیر پاؤں میں ڈال کر کٹ یا اسی طرح یہ زندگی قابلوں میں ہے۔ لیکن یہ حضرت نے بخیر ظاہر زنجیر سوار لئے پھر اسی طرح ہر طرف لگے تھاپیں بھرنے اور اس سے وہ جھٹکا پیدا ہوئی جس نے "کویت" نام پایا۔

مجھے اس غریب دیب کی زنجیر اس لئے بھی پسند ہے کہ اہل کی شہری تہذیب کے بھاگ کر وہیات کی مرادہ نقد اس زندگی کا بھیندہ سو ڈرنا چاہتا ہے اور میں بھی باوجود اپنی "امیرانہ ادبیت" کے کم از کم نظری طور پر موجودہ تمدن سے بیزار اور عدالت کا دلدادہ ہوں۔

تھکنے لکھتے ہیں:

"میں گیت جمع کرتا ہوں، عوام کے گیت ان کے شگفتہ کچھ جو بن کے گیت احسن کے خواب پریم کے ترانے، چھوٹ کے گیت لکھنؤ کے آیت، زندگی کی ہر لہر کے گیت، ڈکھ اور غریبی کے گیت"

ان کے لئے گاؤں گاؤں جانا ہر صورت میں لوگوں کے دلوں کا مطالعہ کرنا۔ یہ ہے اس خاندان بدوش مدینہ کا کام۔ لیکن اسی پر نہیں:

"میں حاروں کی طرف دیکھتا ہوں۔ جہنم لائے تارے مستی میں ناچتے بہشت کے چراغ ہی تو ہیں۔ چکوا چکنا ہی زندگی ہے صدیوں سے ہم آدمی کو چھپنے کے لئے کہتے آ رہے ہیں۔"

کبھی وہ برا میں ایڑا دتی کے کنا سے جا بٹتا ہے:

"شام کی سرخی آسمان پر اور دھرتی پر خاموش ایڑا دتی۔ یہ نظارہ مجھے کان رکھتا ہے چٹ لیٹی ہوئی ریت پر نہیں بھی لپٹ جاتا ہوں۔ سونڈ رو رہا ہے۔ یہ ایک نظارہ ایڑا دتی کا کنارہ۔ صدیوں سے وہ یوں ہی رہی ہے۔ وہ اس دیس کی ماں ہے۔ لوگوں کے قلموں کی مانند ہے۔ جیسے کہہ ہی ہو میں نے ہی انہیں منسا منگا دیے یہ دنیا مجھے پسند ہے۔ زندگی ہونی چاہئے مری کی طرح، کھٹی اور آزاد ایڑا دتی کی طرح۔ یہ تیر و سوسریل ہی مری سے شروع میں کوئی بھی عدویہ جاننے کی پروا نہیں کرتا کہ اسے کتنی دور جانا ہے۔ وہ سینے لگتا ہے یہی زندگی ہے۔"

خاندان بدوش ادیب ہویاؤں میں مضامین بھیجتا کہ اپنے سیر و سفر میں ان کی "مزوری کا انتظار" کرتا ہے۔ ہوا کے اس مایہ کناسے امیر اور غریب کے درمیان عامل محبت والی "خنج" کا نظارہ دیکھ لیتا ہے۔

مُحرکہ اُٹھتا ہے ”کب بدے گی سماج کی حالت“، پھر لکھتا ہے :

”ایراوڑی ہرنے زمانے کا استقبال کرتی آئی ہے۔ وہ ہنسی رہی ہے، ہنسی زندگی ہے۔ اُس میں طوفان بھی اُٹسے میں اور اسکے سماج میں بھی ایک بڑا طوفان آکے اُٹسے گا۔ لکھنا تو فی وجہ پسندی کی ہوئیں اُکھڑ جائیں گی۔ کوڑا کرکٹ بہ چلے گا، اور پھر شاید ایراوڑی کے پانیوں پر لوگوں کے آنسو بھی نہ گریں گے۔“

دیکھ آپ نے ادھر ایراوڑی مصنف کو شہتی دیتی ہے ”لیکن ادھر مصنف کو ایک طوفان اُٹھتا دکھائی دیتا ہے۔“

برما کے لوگ ہندوستانیوں کی طرح مُردہ دل نہیں :

”جدھر نگاہ اُٹھاؤ جنتے ہوئے چہرے۔ لوگ تو میں نے بہت دیکھے بھالے میں رگھٹ گئی کٹ پانی پیا ہے۔ اتنے خوش لوگ پہلے دیکھے بھی مول تو یاد نہیں آئے۔ اتنی بھی کیا خوشی ہے؟“

گویا ہندوستانی مصنف کے لئے اتنی خوشی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔

”مسد یوں سے اس دلیس کی صورت آزاد ہے۔ مرد نے اُس کی آزادی اور خوشی پر چھاپا نہیں مارا۔ اکثر وہ اپنے خد وند کی وفادار رہتی ہے۔۔۔“

لشکا دلیس ”بھی ہندوستان سے مختلف ہے :

”ادھر زندگی کہ مہیا ہندوستان کی اوسط ہے۔ جس کی زندگی سے اوجھا ہے۔“

”ادھر سہاگن اور بیوہ کی بھی کوئی پہچان نہیں۔۔۔“

اور اس فقرے نے مجھے بڑا اُڑا دیا :

”شہرت کرتے ہوئے اُکھڑا کی طرح خوش پوڑا شہین ہر پھر اُکھڑنے ہوئے نکل جاتے ہیں۔“

شاید اس سا دھو مسٹف ”کو بھی اُنہوں نے گھٹور کر دیکھا ہو لیکن اب سنی 19ء میں یہ کچھ ایسے سا دھو نہ رہے تھے، چنانچہ اُنہوں نے لشکا والوں سے بھی غرار وصول کر لیا :

”اب میں کچھ اتنا غریب نہیں۔ کو لمبو کے اخبار سے مجھے اپنے نمائین کا ماحضہ لینے لگا۔ یہ نہ سچ پوچھئے تو یہ سادگی پسند خانہ بدوش۔ دھوکھی تھا ہی نہیں۔ بڑا پھاری والے قفسے میں بیٹھ تری کی کہانی سن لو۔ کچھ پچھلے انداز میں اور پھر بھی کسی وقت یا سے سنتا نہیں۔ آپ جیتی تھکتے ہیں :

”میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہاتا جاتا تھا۔۔۔ اُس کی لمبی لمبی پلکیں اور اس کے ابھرے، مہنے گال کیا یہ سب مایہ ہے؟“

ملے دور جھکوں میں پھول کھل گئے۔

اور بے درعوض کہتے ہیں :

”اس پیار سے فلاں اراضی ہونا ہے تو بوجائے یہ بات تھی تو یہ صورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے۔۔۔ کیا برہمچریہ ہی سب کے اونچی چیز ہے، کیا اس کے لئے سب لطف چھوڑ دین چاہئے، یہ سب لطف جو خوبصورتی، گر خوشی اور از خود خوشی سے مل کر بنا ہے؟“
 داد برہمچاری جی ! ”سچ ہے آدمی کہتا چھپا رہنا ہے“ ”چھلو“ والی داستان میں پہلی اس رنگ کی جھک ہے۔
 آپا معلوم قذیبے کو با ”جوگی“ آتر پہاڑوں آبا، مصنف دیکھنے کو بھولا بھالائے لیکن اس کی نظر طرف لگی رہتی ہے شہ ہونے لگتا ہے کہ چرند کا تنے والی دو شہزہ کے جنگلی کبوتر میں بھی آپ ہی کا جلوہ ہے : ”جنگلی کبوتر نے مینوں تنہا رنچ اٹھ ماری“ اس کے جانے پر آج دسے شہیں منڈت، کھنڈ بھگت کے باگیاں لینے لگے، ”والے نوجوانوں میں شاید ”برہمچاری جی“ بھی شامل ہوں ! یعنی یہ ”بودی والا“ تارا“ ایک عام صلت پھر تارا انسان ہے !
 ہر شخص سے، ہر جانور سے، ہر چیز سے مصنف کو جو محبت ہے وہ قابل رشک ہے، تنہا بیک گرا ہے، عوام سے لگے ہوئے، اسی لئے اس مجموعے میں مستند نظیں نہ لیں گی بلکہ عوام کے گیت اور دو بھی دیہاتی گیت۔
 ”دھرتی کے بیٹے، کون ہیں، درخت !“

”ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا ایک لطیف جذبہ قائم ہے اور یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔۔۔ بوڑھے بوڑگی لگے ہوں میں ایک ٹھوس سچائی بھری ہے۔ دیہاتی جو محنت مشقت کے بعد چھاؤں میں بیٹھے ہوئے کسان اور مزدور کو صدیوں سے محسوس ہوتی رہی ہے۔۔۔ نہ تھا آدمی بھلا نہ تھا درخت۔“

کئی ہونے نہ بنان درخت ٹائی، کھانا ہووے پتہ جھٹ دا !“
 یہ مصنف نراناخی پسند نہیں :

”زمین میں جاکر رہے ہوئے درختوں کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے۔
 ”ہر ہر ہر گی دروازے پھر کدو سے مصنف کی عمل پسندی جوش میں آگئی ہے :
 ”ہم سب دیہاتی گیتوں میں ہر ہر کی نکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گو
 کو ایسی بوجہ مت سمجھئے جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح ملتی جاتی زندگی کے دن کا شکر چٹے بنتے ہیں یہ سمیٹ میں سارا گاہوں مل کر قتل ہے بل کر کر دے بدلتا

۱۔ ہوگی پہاڑ سے چڑھتا ہوا۔

۲۔ چرواہے والی روکیوں کی فصل بن چکی کہوڑنے بچھ آئے سے اٹھ رکھا !

۳۔ آج کل کے شوقین لوحان و محبوبہ کے گالوں پر کھانا لگا کر بوسے لیا کر لے پیا !

۴۔ شہاب یا ڈم دار تارا۔

۵۔ سستہ ہم کو درخت جھل میں، کیدو اور نہ کسی کسان کا بیٹا اکلوتا ہو۔

ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ٹھیک اور غریبی مٹ جائیں اور کم ہوتی آزادی اور بہتر ضبط ہو جائے۔ ان پر جو کچھ محسوس ایک بنامستور پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف قسمت پر تکیہ کر رہے ہیں۔ اس پر بھی کچھ بڑے لگتا ہے اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں مداخلت ہی بنی رہیں گی، سمجھنا شروع ہو جاتا ہے۔

وطن کی محبت تیار تھی کہ رگ دے لیے جس کو جہان ہے :

”ہندوستان کے طول و عرض میں ہرنی کی چکار گوچ رہی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کیا ہمارا وطن اپنی بے کس ہے گا؟ کیا ہماری قوم لوں ہی منہ بسورتی رہے گی؟ ہنگامی بے کس تک اس کا چھپکا کرتا رہے گا؟ کب ناپے گی ہرنی خوشی میں آکر؟“

”خانہ بدوش مصمت“ کو غلام سے گہرا عشق ہے اور ہونا ہی تھا۔ ہمارے کالوں کی زندگی جیسا کہ مسکرمہ کی نے پڑا ہے اس کے متعلق لکھا ہے ”ایسی غریبی اور جہالت میں گر رتی ہے کہ غم ان کی تفریح کا ایک ہمان بن جاتا ہے۔ دکھ اور پینا سے وہ بچوں کی طرح ٹھیسے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔“ لیکن اس دکھ درد کا دوسرا پہلو بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ یوپی کے دیہات میں چاروں کی محسوس میں ت کو:

”جب دھوکہ بخنے لگتی ہے ساری فضا اس کی تکریم پر ناچ اٹھتی ہے۔ اور ایسا معاملہ ہوتا ہے کہ زوہاں کوئی غزبت باقی رہی ہے۔ ذکر کی غلاظت الاؤ کی سنہری روشنی

میں گئے ٹکڑے آدمی بھی کتنے بھل دکھائی دیتے ہیں کتنے خوش ہیں یہ لوگ جیسے

ماہی، سال اور مستقبل کے سارے پسینے سچے ہو گئے ہوں۔ کتنا مذاق، کتنی چٹکیاں، کتنے

تقسیمے کتنے لطیفے، بسبب اس الاؤ کے جنہیں ہم جوان کی دلی کیفیت کا بیکند دار ہے۔

”مناہ بدوش مصمت“ کہاں کہاں جاتا ہے۔ اُس کے کان میں کیا کیا ہوا اور ہنسی پڑتی ہیں:

”کھلی آزاد ہواؤں کے لئے میرا دل ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ ہوا میں سچے اڑنے لگے

پھرتی ہیں اور ہوا فرز جمل پڑے۔ تو بھی ہیں۔ رات گئی دن آیا، دیکھ کیسے نہ

پڑا ہے با کا سایہ۔ ہواؤں کا یہ پیغام میں روز سنتا ہوں۔ میں ہوں خاصہ بدوش

ہمیشہ سرک مچھوڑے کتی ہے۔ جیو آجی اور آگے چلو کبھی کبھی دور ت کا خط آ

جاتا ہے تو زندگی اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے صرف دوست ہی کمانے میں۔

پتا جی! ہم لٹکا کب جائیں گے؟

چپ بیٹی ابھی پیسے تو آنے دو کہیں سے۔

کہاں سے پیسے آئیں گے؟

خدا بھیجے گا۔

ضرور؟

’ہاں ضرور‘

کو تیا ہنس رہی ہے، اُس کی مال بھی اور میں بھی۔“
آخری مضمون جنگلی کبوتر“ میں خانہ بدوش مصنف اپنے گاؤں کا کیسی سادہ اور لطیف بان میں ذکر چھیڑتا ہے:

”ہاں کی گود کی طرح بیکافل بار بار مجھے بلاتا ہے۔۔۔ چاروں طرف کتنے ہی چھوٹے
چھوٹے گاؤں ہیں۔ راس کا دی نکس پتھر لگا آبا، اس سے کبھی پے لگا میں بھی
گھوم پھا آبا۔ مگر پاس کے یہ گاؤں میری نظر سے پرست رہے۔“
کتاب ان لفظوں کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

”جنگلی کبوتر کی طرح جو آسمان کی وسعت کا دورہ کرنے کے لیے پھر ہرتی پڑتا ہے میں بار
بہاں پیدا آبا ہوں۔ یہ ساری ہرتی مجھے جانتی ہے۔ یہاں میں نے جنرلیا میرے پسند میں
جو درجہ ہے حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ گاؤں
میں بیٹھنے کے لئے مجھے جگہ نہیں ملتا غربت بھی ہے اور سفر کی بھی نگرانی کو خوش کرنے
والے لگتے بھی تو ہیں۔ ٹھکن اتار دینے والے، ڈالوا ڈول روحوں کو نور فراموشی کے
یال میں رہ جانے والے۔ ریگیت ماضی کے بیٹے ہیں اور مستقبل کے ماتہ دار کئے جاؤ
اور گائے جاؤ اپنے گیت پڑانے اور سننے دھرتی کے بیٹوں۔“

مصنف کے گاؤں کا نام نور پند کاؤں کے لئے ڈالنا، اوس ضرور ہے مگر حباب طنی و منطق کی
پر دا نہیں۔ وہ اپنی سادگی و پُرکاری سے سخت کو نرم اور کھٹ کو شیریں بنا دیتی ہے۔ یہی کام
سنیاری بھی صاحب نے کیا ہے۔

کتاب کی تمثیلوں ہے:

”گھوم گھام کر میں ادبی دنیا کے کوچے میں بد فقیر کی طرح اپنا کچھول لئے آنکلا ہوں۔“
سنیاری صاحب اگر فقیر ہیں اور پچھلے سے نظر تو کچھ لیے ہی آتے ہیں، تو وہ بڑے سے کے فقیر ہیں۔
بعض مجھے یہ صفت ہیں کہ اپنے کمرے کی میز پر بیٹھ کر لکھنا چاہتے ہیں اور بعض خانہ بدوش مصنف سے
ہیں کہ جب تک ام چنڈر جی کی طرح لنکا کا سفر نہ کریں ایک مختصر مضمون لکھنے کو بھی ہاتھ میں قلم نہیں
اٹھاتے۔ مزاج ہو تو آبا!

میں اُوپر لکھا ہوں کہ میں اس کتاب کو لٹاؤ کی چیز سے لکھنا نہیں چاہتا میں تو اس سے
لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔ سنیاری بھی صاحب اپنے خط میں مجھے لکھتے ہیں میں صرف تعریف نہیں چاہتا۔ آشوارو
اور مشورہ کے بنا مقدمہ کا رنگ چمکا ہی رہتا ہے۔ ”مقدمہ چمکا با ہویا شوخ“ میں نے کتاب پڑھ کر لطف اٹھا
لیا اور جو لکھنا تھا لکھ دیا۔ ہاں مصنف کی تسبی کے لئے اتنا اور لکھ دیتا ہوں کہ بعض ہندی لفظوں نے بڑا مزہ

دیبا کیوں اگر لگو" اور اسپر کے سے شبوں کا بھل نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔ البتہ حق یہ ہے کہ یہ دخل درمعقولات ہے بہت کم۔ ایک اور بات کی بھی مجھے ذرا سی شکایت ہے۔ دیہاتی گیتوں میں ایسے گیتوں کو جو کہ نہیں ہی گئی جو عام فہم اردو سے تعلق رکھتے ہوں، میرے ایک یوپی کے دوست نے بھی جنہیں میں نے اجنہا نہ اور یوپی کے گیتوں کے مشمولہ نمونے سنا ہے یہی شکایت ظاہر کی۔ امید ہے کہ آپ کسی آئندہ تصنیف میں مصنف اس کی کوئی اور رائے لکھیں گے۔ اس سلسلے میں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سنیا رکھی صاحب فرقہ وارانہ مقصد کے پاک میں۔ چنانچہ اپنے مضمون ہرنی کے اخیر میں لکھتے ہیں :

”ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا تقابلی مطالعہ بہت اہم ہے۔ ان صوبوں میں بھی جہاں مند و آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبان میں ہنس کر کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں لکھتے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار لکھتے ہیں محسوس ہوا ہے کہ زبان کے تعلق ہمارا مقصد کے سے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ دیکھ کر کسی لفظ کا استعمال نہیں کرتے کہ اس کا حساب، جہاں استعمال یا مذہب کیسے بلکہ لفظ ان کی زبان پر اسی طرح آتا ہے جیسے دھرتی پر کوئی پودا لگتا ہے۔“

اس سلسلے میں بعض ان شریں جنہوں کا اعادہ کر دینا چاہتا ہوں جن سے میں نے خاص طور پر لطف

اٹھایا :

”شاعری کی زبان جذباتی فضا میں قائم ہوتی ہے لفظوں میں ایک قسم کا پیرا پیدا ہوا باقاعدہ رتی بات ہے۔“
(مجھے کل کرنا چاہئے کہ سنیا رکھی صاحب نے کبھی نہ مجھے گا کے سنایا نہ ناچ کر دکھایا۔“ خاندان بدویش مصنف ضرور ان فنون سے واقف ہوگا۔)

”میری کے سینے میں جیسے مورتی پروان چڑھتا ہے گاؤں کے سینے میں گیت پلٹے ہیں۔“

”غور کو سطحی انداز سے دیکھنا کتنا آسان ہے بہت کم ہیں جو اس کے چہرہ نہیں دیکھتے دلی دیکھتے ہیں۔“

”پہلے ہل پرندوں کے سینے میں دل کر آدمی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ہوگی اور اس سے مجھے ایمرن کا وہ فقرہ یاد آگیا کہ اگر شاہی دس ہزار برس میں صرف ایک رات نظر آتے تو انسان صدیوں میں نظر کو نہ سمجھتا۔“
مصنف نے گیتوں پر یوں تبصرہ کیا ہے :

”گیتوں کے جذبات ان کی زبان سے کہیں زیادہ پڑنے ہوتے ہیں۔“

”گیت کیا ترجمہ کی چیز ہو سکتی ہے؟ ... ترجمے میں وہ خوبی نہیں پیدا کی جاسکتی جس سے

دیہاتی موسیقی کا جلاو ایک ایک لفظ میں جذبات کی تصویر کو زندہ کر دیتا ہے۔“

”لوں گیت تو سبھی اپنی اپنی جگہ دل کی سمی ہوئی زبان میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیتے ہیں مگر غنا گیتوں کی بات ہی کچھ اور ہے ... زندگی میں غم ہے بھی زیادہ۔ تو غم کے گیت ہمیں کیوں نہ پسند آئیں؟“

”دیہاتی گیت بالکل سادہ ہوتے ہیں، اس لئے وہ تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی عموماً گیتوں کی شناخت ہے۔“

”پنجابی شعروں کی زبان ہے۔ صدیوں سے پنجابی گیت زندہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تک پنجاب کے میدانوں میں دریا بہتے ہیں، اس کے گھیتوں میں گیہوں اور باقی اناج پر لیا ہوتے ہیں، اور جب تک تنہا میں غور میں باہم مل کر چڑھ کا تھی ہیں، یہ گیت مر نہیں سکتے۔“

”خدا کی مامضت کے بنیادی ترکم اپنی آپ جتنی سنا کر میں زندگی اور موت کے دورا ہے، پر نہ پہنچتے ہیں۔“

پنجابی گیتوں پر مصنف سرستے اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی انہیں نے مزا دیا :
”چرخے دی گورچ کس کے، جوگی اتر رہا ڈوں آیت۔“

”میرا لئے چل چڑھ اوتھے، اوسے جتنے نیرے مل فکدے۔“

مجھے شب نہیں کہ ”چڑھ“ اور مل دیہاتی زندگی کے دو بڑے پٹ ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ اپنی ماوری بولی کے گیتوں ہی میں کویتی مانی رہ سکتی ہے،

”اڈنی چڑھے، اڈوے کا لوال

کویتا کھیدے نال بھراواں۔“

”کویتی بی زانی

سوہریاں دے گھر جانی۔“

”مٹدے اپنے تھائیں رہندے ہے

فی دھیاں کیوں بنا لیاں رت نے۔“

”خامدوش مصنف کے گیتوں کی دور دورہ نشروں سے مت پر جی ہے۔ ہندی، اردو، پنجابی، انگریزی

رسالوں میں ان کے مسامین معاوضے پر چھپتے ہیں۔ امریکہ کے رسالے البتہ ان کے بھی انہیں ظاہر نہیں مل سکتا

ہے۔ وہ ہندوستان کی تیس زبانوں سے گیت جن کر چکے ہیں، اور ان گیتوں کو کئی بار سے بڑے آبی سن چکے

ہیں۔ دنیا بھر میں صاحب گھر بیٹھ کر دیہاتی گیت گانے کے قابل نہیں۔ وہ ایسے خامدوش ہیں کہ غریب کی

کوٹھڑی سامنے آجائے یا امیر کا محل پہنچے انسان راہ میں مل جائے یا کسی لیڈر کا تہ پیلے وہ بہ کر نہیں جاسکتے

۱۔ چڑھ کی گورچ کس کے جوگی پہاڑ سے نیچے اتر آیا۔

۲۔ میرا چڑھ وہاں لے چل جہاں تیرے مل چل رہے ہیں۔

۳۔ اڈو جانی چڑھا، اڈو جانی کتے کویتا اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔

۴۔ کویتی بی زانی ہے۔ وہ سسرال میں جانے والی ہے۔

۵۔ اڈکے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں۔ ہائے اڈا نے بیٹیوں کو کیوں جنم دیا؟

ہیں اور ہر سستی سے جا بھٹتے ہیں معلوم نہیں انہوں نے کبھی اپنی نسبت پر سوچا ہے کہ وہ بڑے ”پرچارک“ آدمی ہیں اور گویا ہر جگہ یہ سدا بلند کرتے سنے گئے ہیں بسہ ہاں بھڑا کر ترزا بھڑا ہو گا۔ اور درویش کی صدا کیا ہے ؟ اور آج کل کے درویش کو ہونا بھی ایسا ہی آدمی چاہئے جسے کہ وہ ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک بچہ ہوتا ہے اُن کا کچھول۔ اُس میں ایشیا، ماڈرن ریولیو، ”بھائیوں“ ”وشال بھارت“ ”بھیلو اڑی“ وغیرہ رمالوں کی فائلیں ہوتی ہیں جن میں اُن کے مضامین چھپ چکے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے متعلق اٹھ صفحات کا ایک اعلیٰ درجے کا پمفلٹ نکال دکھاتے ہیں جس کے سرورق پر اُن کی پُر رعب شبیہ ہے۔ ایک صفحہ اُن کی خود نوشت ہوا نظمیری کے لئے وقف ہے۔ پھر شیگوراکا ندھی، سروجنی نامیدو، ایڈیٹر ماڈرن ریولیو اسی الین اینڈ ریولیو وغیرہ سے ملاقات کا ذکر ہے اور اُن کے متعلق ان بڑے آدمیوں کی رائیں۔

مجھے یہ دیکھ کر سستی بڑی لگے تھی۔ ”میرا ادب“ کی طرح سستی تھی صاحب کے ”فقیر“ بھی ایسا کمزور کھٹے ہیں جس سے دو مقامات اور اشخاص کو اپنے ساتھ لٹا کر کے اُن کی تصویر اُتارنے اور پھر شائع کر دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں مشہور اشتہار ادب۔ جیسے چھپانے کی کیا بات ہے۔ تصویر رنڈ سے بولتی ہے۔ یہ ہے منظور رتے ہوئے بھی منظور نظر بننے کا ڈھنگ اور کیوں نہ ہو ہندوستان میں مصنفین کے لئے اتنی خود پسندی بھی جائز نہ کبھی جائے تو بیچارے کیا کریں ؟

اس پمفلٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ستیا رتھی صاحب شہر شروع میں خدا کے فضل سے بلاٹ ریل کا سفر کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی فادرستی تک بھی لوہے پہنچ جاتی تھی۔ کیا کرتے ؟ جنگال سے لمبھی اور کشمیر سے کمبھتہ کے متحدہ مسافر اور پتھروں گاؤں گاؤں گھومنا کوئی بدھنگو کر سکتا ہے یا پھر حضرت ستیا رتھی بجا ہاں انہیں بہت سی وقتیں کا سامنا ہوتا ہے وہاں بلاشبہ انہوں نے زندگی سے خاصا خلقت بھی اٹھا یا ہے اور ضیاء کا مَر دکھا یا ہے۔

ٹیکور لکھتے ہیں :

”ہم پرونیسیر ستیا رتھی کے نمونوں میں کہ انہوں نے ہمیں عوام کے نفس کے حقیقی پہلو سے دویا کرایا ہے۔“

گاندھی جی کہتے ہیں :

”ہم شری ستیا رتھی کے مؤخر استقلال کے مدح ہیں جس کی بدولت ہم حرام کے ادب سے روشناس ہوئے۔“

سروجنی نامیدو کہتی ہیں :

”میں ستیا رتھی کے کام کی دلدلہ ہوں۔ وہ ایک سادہ صوفی طرح گاؤں گاؤں جاتے ہیں اور ہندوستان کے وہ گیت جمع کرتے ہیں جن سے ہمیں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ساری نوع انسان کی حقیقت

میں ہوں خانہ بدوش

۱۶

ایک ہی گھرانا ہے۔ بچوں کی کوریان اور چرخے کے گیت ایک دوسرے سے ہزاروں میل و ملکوں میں بھی ایک دوسرے سے کس قدر ملتے جلتے ہیں

مئی ۱۹۴۲ء میں جب ہمارا مصنف مدراس ہینچا تو سٹراچ گوبال اچاریہ نے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

”پروفیسر ستیا رتھی، ہم سے عوام کی ذکاوت کے علم بردار میں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں اُن کے ساتھ کا دوسرا آدمی موجود نہیں۔ اُن کا شن حب الوطنی سے بھی بلند تر ہے۔ عوام لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن گیت گانا خوب جانتے ہیں۔ خیال سے راگ تک صرف ایک چھلانگ درکار ہے۔ یہ ہے دیہاتی گیتوں کا شن۔ ہماری یونیورسٹیوں کو ستیا رتھی صاحب کی مدد کرنی چاہیے۔“

غرض ہمارے ”خانہ بدوش مصنف“ نے صرف دیہاتوں میں آوارہ گردی نہیں کی بلکہ شہروں میں بھی اپنا حال پھیلایا ہے۔ پچھلے دنوں میں یہ قدر لکھنے کو تھا کہ میرے بیٹے منظر بشیر نے ۲۲ جون ۱۹۴۷ء کے ٹائمز آف انڈیا کے ہفتہ وار بالخصوص ایڈیشن میں مجھے عالمی تصویروں میں ایک تصویر دکھائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ستیا رتھی صاحب جلوہ گر ہیں۔ کسی مدراسی نے پری کوشیے میں ”اتار کر“ جو تصویر اخبار میں بھیجی تو فوراً ”زاید الغام“ پایا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے ”ستیا رتھی“۔ یہ ہے بھاروڑ کا گیت منگا ”خانہ بدوش مصنف! میں انہیں ایک دوست کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“

بشیر احمد

کراچی ۲۸ جون ۱۹۴۷ء

اپنی بات

گھوم گھام کریں ادبی دنیا کے کوچے میں ایک فقیر کی طرح اپنا
کچھول لئے ہوئے آنکلا ہوں۔ اس میں میری اپنی تسلی بھی شامل ہے
جس کے بغیر میرا قدم اس آرام سے نہیں اٹھ سکتا جس سے کہ میں
صحیح معنوں میں لطف اٹھا سکوں۔ اس سرک پر میں اکیلا نہیں ہوں
مگر اکثر اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ آگے کون کون نکل گیا اور پیچھے کون
کون آ رہا ہے۔ دائیں بائیں ساتھ ساتھ چلنے والوں سے بھی میری
پوری واقفیت نہیں۔

وٹوق سے نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کے گیتوں کی طرف میرا دلی
میلان کس طرح ہوا۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بچپن میں اپنے گاؤں ہی
میں یہ شوق پیدا ہو گیا تھا جب کہ بیسیوں گیت میرے ذہن میں جڑ
پکڑتے چلے گئے تھے۔ انہیں قلم بند کرنے کا خیال ۱۹۲۴ء کے آخری

دلوں میں پیدا ہوا۔ اور میں نے پنجابی گیتوں کا مجموعہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ یہ شوق جس کی ابتداء محض ایک شغل کی صورت میں ہوئی تھی پھر اتنا بڑھا کہ ۱۹۲۷ء میں کالج سے منہ موڑ کر بغیر بہت سوچے سمجھے یا کوئی منصوبہ باندھے بے سروسامانی کی حالت ہی میں میں نے خانہ بدوشی اختیار کر لی۔ ان دلوں کے خبر تھی کہ اتنے لمبے عرصے تک یہ شوق قائم رہ سکے گا۔ آج سے تینتیس سال پیشتر جب کہ روس رجعت پسندی کے تاریک اور غمناک دور میں سے گزر رہا تھا، میکسم گورکی نے اپنے ایک مضمون میں پیشینگوئی کی تھی :-

”عوام میں مادی برکتوں کو ہی پیدا کرنے کی قوت نہیں ہوتی وہ روحانی برکتوں کو بھی جنم دیتے ہیں۔ وہ اُس ماں کی طرح ہوتے ہیں جس کی گود سداہری رہتی ہے۔ وہی دُنیا کے پہلے فلسفی ہیں اور وہی پہلے شاعر بھی۔ دُنیا کی بہترین شاعری المیہ ناکہ اور ان سے بھی اعلیٰ چیز یعنی دُنیا کی تہذیب کی تاریخ، ان سب کی تخلیق انہی نے کی ہے۔ بچاؤ کے خیال نے نہیں اُبھارا اور زندگی کے ابتدائی دور میں خالی ہاتھوں ہی وہ قدر سے بھر گئے۔ ڈرا جیرانی اور خوشی سے متاثر ہو کر انہوں نے مذہب کو جنم دیا۔ یہی مذہب ان کا شعر و نغمہ تھا، اسی میں

قدرت کی طاقت کے مستحق اُن کا سارا علم اور تجربہ، جو باہر کی طاقتوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اُنہیں حاصل ہوا، پوشیدہ تھا۔ ”قدرت پر اپنی پہلی فتح سے دھرتی کا بیٹا خود دار بنا، اُسے اپنی طاقت کا احساس ہوا اور اس کے بعد نئی فتح کا شوق سمایا۔ اسی نے پھر اُسے بہادروں کی کہانیاں گانے پر مجبور کیا جو کہ اُس کے علم اور طرزِ عمل کا مجموعہ بن گئیں، کیونکہ لوگوں نے اپنا مجموعی علم دے کر کبھی اپنے کسی بہادر سردار کو دہمناظر کے ساتھ ایک قطار میں اور کبھی اُن کے بالمقابل کھڑا کسیدہ روایتوں اور بہادروں کے گیتوں سے، جیسا کہ اُن کی زبان سے بھی ہمیں کسی اکیلے آدمی کا نہیں بلکہ لوگوں کی مجموعی تخلیق کا پتہ چلتا ہے۔“

اُن دنوں گورکی کا خیال ایک پروگرام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ لوگوں کے نسل در نسل چلے آنے والے زباںِ زد گیت اور کہانیاں اُن کی مجموعی قوتِ ارادی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اپنی خانہ بدوشی کے دوران میں اُس نے مختلف روسی لوگوں کے گیتوں اور کہانیوں میں ایک زبردست اُمید کی جھلک دیکھ لی تھی اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ”لے شخصیت کی بربادی“ — گورکی (صفحہ ۱۴۰)۔

ٹوٹوں کے سینوں میں یہ یقین بھی پالیا تھا کہ انسان کا مستقبل روشن ہے اور کوئی دھبہ نہیں کہ کبھی کسان اور مزدور فتحیاب نہ ہوں۔ ادب کے اس حقیقی پسندیدہ نے اس وقت تک بند پایہ روسی ادب میں بھی اتنی جڑ نہ پکڑی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جب یاس اور غلامی میں جکڑے رہ کر بھی یعنی بڑے اور جماعت کی پیدا کی ہوئی حالتوں میں بھی ادیبانی گیت اور کہانیاں نہ روہ سکتے ہیں تو مزدوروں کے آزاد ملک میں تو لوگوں کے اس قومی ادب کی گہرائی، فنی زوہ اور اونچ کنی گن شادار ہوا ٹھہیں گے۔

تعب تو یہ ہے کہ گور کی کا خیال، جو کہ میری پیدائش سے ایک سال پیشتر روس کے ادبی ماحول میں گونج اٹھا تھا، اٹھارہ سال کی عمر تک بھی جب کہ میں پہلے پہل گھر چھوڑ کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا تھا اور جس وقت کی ایک ذہنی تصویر ”برہمچاری“ میں محفوظ ہے، مجھ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

اب دیکھتا ہوں کہ اس وقت مجھے دیہاتی گیتوں کی قومی اہمیت کا بالکل پتا نہ تھا۔ نہ ہی میں نے سوچا تھا کہ مجھے ان پر مٹا مین لکھنے ہوں جس سوک پر میں چل پڑا تھا، اس کی منزل مقصود کیا ہے یہ جاننے کی میں نے پروا ہی نہ کی تھی۔

لاہور میں چند پٹھان نوجوانوں سے میری آشنائی ہو گئی تھی۔ وہ پشتو گیت گیت سنا کر ان کا مطلب سمجھا یا کرتے اور میں دیکھا کرتا کہ پنجابی اور پشتو گیتوں

کے جذبات کیسے بنگلہ گھر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ایک کشمیری دوست کی زبانی کشمیر کے گیت سننے کا موقع ملا۔ پنجابی اور کشمیری گیتوں کی بیگانگی بھی صاف ظاہر تھی۔ ہر زبان کے گیت جمع کروں، یہ خیال منجھتا ہوتا گیا۔ اور شاید غیر شعوری طور پر یہ بھی خیال رہا کہ ان گیتوں کا بالمقابل مطالعہ بہت دلچسپ رہے گا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شروع میں گیتوں سے کہیں زیادہ ایک قسم کی آوارگی کے خیال نے ہی مجھے گھر چھوڑنے کے لئے ابھارا تھا۔ اسی لئے پہلے میں نے کشمیر کو چنا جس کی خوبصورتی کا چرچا میں نے بہت سُن رکھا تھا۔ میرے مضامین پہلے ہندی رسالوں میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ پھر میں نے اردو، انگریزی اور پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ اردو میں میرا لے مضامین ہندی میں "وشال بھارت"، "ہندی سنڈیش"، "اندھا"، "ناگری پرچارنی پترکا"، "وشو مشرا"، "ہنس"، "ہندوستانی"، "ہندی پرچار سماچار"، "مداس"، "اور سادھنا" وغیرہ میں۔ انگریزی میں "امرت ہار"، "پترکا"، "ماڈرن ریویو"، "کنٹرییری انڈیا"، "ٹریبون"، "دی کنٹری ٹوین"، "لندن"، "دی انڈین پی۔ای۔این"، "جنرل آف دی آندھرا ہسٹوریکل سوسائٹی"، "رورل انڈیا"، "انڈین ریویو"، "دی نیو ریویو"، "دی آئین یا تھ"، "دی ہندو مدراس"، "دی سیلون ڈیلی نیوز"، "دی سیلون آؤر رور"، "دی ٹائمز آف سیلون" اور مشہور امریکن رسالہ "ایشیا" میں۔ اور پنجابی میں "دیش دپن"، "پریٹ لڑی"، "پھلوادی"، "کھاری"، اور پنجویا وغیرہ میں شائع ہونے رہے ہیں۔ پنجابی میں میری کتاب "گدھا" جس میں ہر دھریز پنجابی دیہاتی ناچ اور اس کے گیتوں پر بحث کی گئی ہے اس سال میں شائع ہوئی تھی۔ اور دو اور کتابیں "گائونڈا کسان" اور "دلیا بے ساری رات" اس سال شائع ہو رہی ہیں۔

پہلا مضمون ”ہندوستان کے دیہاتی گیت“ پنڈتؑ میں شائع ہوا۔ اس میں میں نے لکھا تھا: —

..... ”کالی داس کے متعلق جو کہانی مشہور ہے، اُسے
 ڈھمکتا مان لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی دیہاتی ماں
 کا بیٹا اور حشمت تھا..... جو گیت اُس نے چرواہے کا کام کرتے
 ہوئے گائے ہوں گے اُن کا کچھ نہ کچھ اثر تو اُس کی مشہور عالم
 شاعری پر بھی ضرور پڑا ہوگا..... اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم
 دیہاتی گیتوں کو جو ادھر ادھر بھڑے پڑے ہیں، اکٹھا کر کے سنبھال
 کر رکھیں۔ یہ گیت ہر قوم کے ادب کی شان کو دوبالا کر سکتے ہیں،
 پڑھے لکھے لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دیہاتی گیتوں
 کو نگاہ محبت سے دیکھتے ہیں۔ مگر ہماری بناوٹی شہری تہذیب اور
 مذاق اڑانے کی ذہنیت اُنہیں ایسا کرنے سے روکتی رہتی ہے۔
 خوشی کی بات ہے کہ اب لوگ دیہاتی گدڑیوں میں چھپے ہوئے
 لعلوں کو پرکھنے کے لئے بے قرار دکھائی دیتے ہیں.....“
 جن دلوں میں پٹھانوں کے گیت جمع کر رہا تھا، پشاور کے ”سفیر سخن“
 میں میرا ایک مضمون شائع ہوا۔ میں نے لکھا تھا:

غیر مالک میں دیہاتی گیت بڑی بھاری تعداد میں جمع کئے گئے ہیں اور ادیبوں نے انہیں خاص طور پر مرتب کر کے ضخیم مجموعوں میں شائع کیا ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں میں ان گیتوں کے بہترین اور چیدہ چیدہ انتخاب کو رس کی شکل میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اس قسم کی سعی اور قدردانی نفی کے برابر ہے۔ گیتوں کے آئینے میں ہم اپنے ملک کی رُوح دیکھ سکتے ہیں۔ ضرورت ہے ایسے اصحاب کی جو ہندوستان بھر کے دیہات میں گھوم گھوم کر نہایت صبر و استقلال سے مختلف زبانوں کے گیت جمع کریں اور انہیں مع ترجموں کے کتابی شکل میں مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہ صرف دنیا کے لٹریچر کی عظیم خدمت نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کے قومی لٹریچر کی تعمیری بنیاد کا کام دے گی۔

پھر ادبی دنیا میں ”ہمارے دیہاتی گیت“ شائع ہوا۔ میں نے لکھا تھا:

” اپنے دیہاتی برادران وطن سے بہت دُور ہم شہروں میں آئے ہیں اور کبھی بھول کر بھی اُس خلیج کو پُر کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو ہمارے شہروں اور دیہات کے مابین

روز بروز وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دیہاتی گیتوں کا مطالعہ ہمیں
اُس پل کا کام دے سکتا ہے جو ہمیں دوبارہ اپنے وطن کی دیہاتی
دنیا تک پہنچنے میں مدد دے سکے۔۔۔۔۔“

اُردو میں میرے مضامین اکثر ’ہالیوں‘ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔
اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ ۱۹۳۷ء کے سالگرہ نمبر میں عبدالرحمن چغتائی کے
آرٹ کا ایک سہ رنگا نمونہ ’دیہاتی لڑکی‘ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔۔۔۔۔
”دیہاتی لڑکی اپنے خیالات میں گم، اپنی راہ کی پروا کئے بغیر اپنی دھن میں
جا رہی ہے۔ درختوں کے جھکے ہوئے سر بھی اُس کی حیرانی کی تصدیق کر
رہے ہیں۔ گویا مصور نے کائنات کو لڑکی کا ہم نوا بنالیا ہے۔ تصویر کا ہر
خط اور رنگ اُس کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔“ اس نوٹ کے علاوہ
ایڈیٹر ہالیوں نے تصویر سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کی یوں ترجمانی کی تھی:

”اے ہندوستان! تیرے بہتے دریاے اپنی گاہر بھر کر وہ تیرے
پہل تلے اکھڑی ہے۔ وہ جس کا دل صدیوں سے اپنے شوہر
اور اپنے بچوں کے لئے دھڑکتا رہا ہے۔ وہ جس پر اُس کے
شوہر اور اُس کے بچوں نے صدیوں ہی ظلم و ستم بھی توڑے۔ اُس
کی گاہر بس آج کل میں ٹوٹنے والی ہے!

”وہ دریا، وہ بہتا پانی، وہ گھریلو دیوی، وہ مٹی کی گاہر ان سب

کا دور ہو چکا۔ اب تو لوہے کے نل ہیں اور موٹر کار اور ڈھکے کانوں
اور سنڈی بھووں والی انگریزی بولتی ہوئی نازک میسیں! اب تو پیل
کے پیٹروں کی فقط تصویریں ہیں۔

”نہیں نہیں، یہ حال وہاں ہے جہاں قصبے پھیل کر شہر بن
گئے ہیں، جہاں شہر فولادی پیٹریوں کی باہیں پھیلا کر ایک دوسرے
کے گھمے ملنے کی فضول کوشش میں بانپ رہے ہیں کہ وہاں رہا
ہیں تو گر لے، اور پیل ہیں تو ناپاک، اور عورتیں ہیں تو بجائے
گاگر سر پر تو لے بھاری بھر کم کتابوں سے لدی پھرتی۔“

لیکن وہاں اے ہندوستان! جہاں تیرے وسیع میدانوں میں
دریا بہتے ہیں۔ اُسی شان اُسی آن بان کے ساتھ جہاں وہاں
کبھی تیز کبھی مدھم، اب بھی پیل کے پتوں سے سرسراتی ہوئی
گزرتی ہیں۔ وہاں اے پیارے وطن! اے دلدادہ رنج و محن!
وہاں اب بھی اپنی اپنی گاگر کو سر پر سنبھالے ایک نہیں، دو
نہیں، بیسیوں وہ سادہ دل، جفاکش ہستیاں تیری پگڈنڈیوں
پر صبح و شام آتی جاتی ہیں جن سے میدانوں کی آرائش اور
زمین و آسمان کی زیبائش ہے، اے میرے محبوب و مقہور وطن!
”سو اُن کو اے وطن! جو تیری بیڑیاں کاٹنے کو شہروں

میں غل مچاتے پھرتے ہیں، اُن کو ان سرسبز و شاداب ویرانوں کی
طوف بلا، جا اُنہیں یہاں کھینچ لایہاں، جہاں نہ بندش ہے، نہ
غلامی، جہاں نہ کالے ہیں نہ گورے، جہاں صبح کے سنہری تخت پر
بادشاہ نہیں بیٹھتے، بلکہ ننھی چڑیاں کھیلتی ہیں، جہاں دریاؤں کے
اُور پل نہیں بندھتے بلکہ جہاں اُن کے کناروں پر قدرت اپنی
پیاسی مخلوق کو خود چلو بھر بھر کر تازہ پانی پلاتی اور مسکراتی ہے،
اے میرے ہزاروں نعمتوں سے مالا مال وطن!

میں نے سوچا کہ یہ شخص جو دیہاتی لڑکی کے متعلق ان گہرے جذبات کا
اظہار کر سکتا ہے، دیہاتی گیتوں کے متعلق بھی بہت ترقی پسند رائے رکھتا ہوگا۔
اور جب میں خود میاں بشیر احمد سے ملا تو میرا خیال ٹھیک نکلا۔ ہمایوں کے
جائٹ ایڈیٹر حامد علی خاں صاحب نے بھی میرے کام کو قومی نقطہ نگاہ سے سمجھا۔
اس ادارے سے مجھے ہمیشہ وہ خلوص ملتا رہا ہے جس کا تعلق مضامین سے
نہیں زیادہ خود میری ذات سے ہو گیا ہے۔ اور میں بے حد احسان مند ہوں۔
مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کا مقدمہ میاں بشیر احمد صاحب لکھ رہے
ہیں۔ پانچ سال پہلے جب میں اُن سے ملا تھا، کیسے خبر تھی کہ میری پہلی اردو
کتاب کا تعارف بھی اُنہیں کے ہاتھوں سرانجام پائے۔

سوائے چند مضامین کے جو پہلے پنجابی یا ہندی میں لکھے گئے تھے،

باقی سب برا اور راست اُردو میں لکھے گئے ہیں اور کتابی صورت میں پہلی بار دُنیا کے ادب کے سامنے آ رہے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کتاب شایع ہونے سے چند ہفتے پیشتر ہی لکھے گئے۔

’دھرتی کے بیٹے‘ ترقی پسند ہندوستانی ادب کے مجموعے ’نئے زاویے‘ کے لئے جسے کرشن چندر ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے، لکھا گیا تھا۔ لاجپت، جھنگلی کبوتر اور لنکا دیس ہے کو لمبو، بالترتیب ’ادب لطیف‘، ’ادبی دنیا‘ اور ’ساقی‘ کے لئے لکھے گئے تھے۔ انہیں یہاں دوبارہ شایع کرتے ہوئے میں ان اداروں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دیوندر ستیا رتھی

لاہور، مارچ ۱۹۴۱ء

دھرتی کے بیٹے

بچپن کی خوشیاں، جن کے نشانات میرے دل پر اب بھی باقی ہیں،
 ہمارے اس بڑے درخت کو بھی یاد ہوں گی۔ کسی دن یہ درخت جوان
 لکڑا اور اس کے جذبات کبھی کسان ڈولہا کے میٹھے سپنوں سے بھی دلکش
 تھے۔ ان دنوں شاید اس کی چھاؤں اتنی گھنی نہ تھی۔ مگر جہاں تک میری
 یاد کا تعلق ہے میں نے اسے بڑھاپے کے دور سے ہی گزرتے دیکھا ہے
 کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، اس کی ہڈیت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی اس
 روز ہوگی، جب میں پہلی بار اس کی چھاؤں میں آ بیٹھا تھا۔
 روز بروز، لمحہ بہ لمحہ اس درخت نے راہگیروں کی گفتگو سنی ہے۔ وہ

خاموش ہے ضرور مگر اُسے دیہاتی زندگی کے سینکڑوں واقعات کا پتہ ہے۔ سینکڑوں جاڑوں، گرمیوں اور برساتوں کی کہانیاں، امیری غریبی کی کشمکش، ان گنت جھگڑے اور تنازعات۔ ان سب نے اُس کے سینے پر بے حد لطیف نشانات چھوڑے ہیں۔ اس کے بچے کا کچا چھوڑا، جواب نصف سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور جس کے متعلق ٹھنڈی چھاؤں کا مزالینے والے چرواہے اور کسان نوجوان اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، پہلے بہت خوبصورت تھا۔ یہاں بیٹھ کر میں نے بار بار اس درخت کے کانپتے ہوئے پتوں کی طرف کھٹکی لگا کر دیکھا تھا۔ کئی بار تو میں اس کے تنے سے اس طرح لپٹ گیا تھا جیسے اپنے معصوم ہاتھ پھیل کر میں اپنے باپ کی ٹانگوں سے جا لپٹتا تھا۔

ہمارے گاؤں کی تاریخ کے ساتھ اس بوڑھے بڑا کا یہ ٹوٹ رشتہ کسی خاص تشریح کا محتاج نہیں۔ ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا ایک لطیف جذبہ قائم ہے اور یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ درخت تو ہمارے گاؤں کے چاروں طرف بیسوں نہیں، سینکڑوں ہیں مگر جو اطمینان مجھے اس بوڑھے بڑے کے بچے بیٹھ کر حاصل ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا بعض اوقات تو میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ وہ گہرا سانس لے رہا ہے اور اگلیوں کی طرف سے نگاہیں پھیر کر میری طرف دیکھ رہا ہے، اس کی نگاہوں میں ایک

مٹھوس سچائی پھری ہے — وہی سچائی جو محنت مشقت کے بعد چھاؤں میں بیٹھے ہوئے کسان اور مزدور کو صدیوں سے محسوس ہوتی رہی ہے۔ یہ درخت یہاں نہ ہوتا تو قریب کا یہ نہر کا پل بالکل بے رونق ہوتا۔ نہر سرہند کی یہ شاخ، جس پر سیر کرنے کے لئے میں خوشی خوشی چلا آتا ہوں، بہت پرانی نہیں۔ اسے ادھر آئے چالیس سال ہوئے ہوں گے جب کھدائی کا کام ہو رہا تھا، مزدوروں اور مزدور عورتوں کی پیسے سے تر پشائیاں دیکھ کر، ان کے ہنسی مذاق اور گالی گلوچ کو سن کر اور ان کے پوشیدہ جذبات میں انسانیت کا بنیادی احساس پا کر یہ بڑ بہت محفوظ بنا ہوا ہوگا۔ اور پھر جب اس پل کی تعمیر شروع ہوئی تھی تو ٹھیکیدار اور سرکاری انجینیئروں کے درمیان رشوت کا رشتہ دیکھ کر تہذیب اور سرمایہ داری کی حقیقت بھی اُن پر غُوب واضح ہو گئی ہوگی۔

”زمین میں جکڑے ہوئے درخت چلنے کی خواہش کرتے ہیں..... اور انسان ایک ایسے سڈگ کی آرزو میں سرگرداں ہے، جہاں سے ٹکٹ دھاری دیتا بھی رہا ہونے کے لئے بیتاب ہیں!“ — بھرتری ہری لکھ گئے ہیں۔ کیا ہمارا یہ بوڑھا بڑ بھی چلنے کی خواہش کر رہا ہے؟ ایسی اچھی جگہ اسے اور کہاں ملے گی؟

وہ ایک راگنیر جا رہا ہے۔ بوڑھا پلے کی وجہ سے بچا پلے کا جسم ٹھنڈا

رہا ہے۔ وہ ذرا رک کیوں نہیں جاتا؟ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ”آ جاؤ۔
سردار جی، ذرا استالو“

میری آواز راگیت تک نہیں پہنچی۔ وہ چلا گیا۔ دُور بہت دور۔ بوڑھا
بڑا خاموش کھڑا ہے۔

میں بھی تو سُنپنوں کے قلعے بنا رہا ہوں۔ چاہتا ہوں دُور اُفق کے پاس
جا پہنچوں، جہاں سُنپنوں کی پریاں لوریاں گارہی ہیں! بوڑھا بڑا خاموش کھڑا
ہے۔ شاید وہ کتنا چاہتا ہے ”دیکھ کس طرح اپنے بازو پھینکا رکھے ہیں، میں نے
میرے ارد گرد! ایک میری مچاؤں کی لوریاں سُندر نہیں؟“

جب تک یہ بڑیہاں کھڑا ہے تب تک یہ آہستہ آہستہ ہر ایک کے کان
میں کہتا ہے ”محبت اور عظمت ایک ہی حسینہ کے دو رخسار ہیں!“ میں اسے
چھوڑنے کا نہیں۔ ٹٹکی لگا کر میں اس کی چوٹی کی طرف دیکھتا ہوں۔

درخت کی خاموش محبت میں وہ غلط فہمیاں کہاں جو آدمی کی دُنیا
میں قدم قدم پر عیاں ہیں؟

۲

”ٹٹ گئے تریں دے موتی“

پتلیاں پوندی دے!“

— اوس کے موتی ٹوٹ گئے جبکہ میں مورنی کی طرح ناچ رہی تھی!

کوئی کسان دوشیزہ گاتی جا رہی ہے۔ اپنے سنہری رتھ پر سوار سورج دیوتا
 بوڑھے بڑکے اور آگیا ہے۔ چوٹی کے پتے جگ جگ گ کر اٹھے۔
 پنجابی زبان کا یہ نغمہ سینکڑوں سال سے دلوں کا سفر کرتا آ رہا ہے۔
 ”رات نے سورج سے کہا، تم چاند کی معرفت پیار کے خط بھیجا کرتے ہو۔
 میں ان کا جواب اوس کی شکل میں گھاس پر چھوڑ جاتی ہوں!“ نیگور نے لکھا ہے۔
 دیہاتی لوکی یہ جانتی تو اوس کے موتی یوں اپنے قدموں تلے زلزلہ دیتی
 بوڑھا بڑ شاید دھرتی کی اس بیٹی کو پکار پکار کر کہنا چاہتا ہے۔ ”تم نے اوس
 کے موتی کیوں توڑے؟“

یہ لو، دو بچے چلے آ رہے ہیں۔ گھر پر ماں باپ گھر کیاں دیتے ہیں۔
 مگر بوڑھے بڑکے پاس مرنے کا مٹھن محبت ہے، جو ان کے ذہن میں گڑتی
 چلی جا رہی ہے۔ سورج کی طرف منہ کئے وہ گارہے ہیں:

”سورج! مورا!!

جھگا دیوں، ٹپنی دیوں

تیرا نوں لنگوٹی دیوں،

کراری دھپت کڈھ دے!“

— ”اوسورج سورج! میں تمہیں قیص دوں گا، ٹپنی دوں گا، اور

مکر کے لئے لنگوٹی دوں گا، تیرا دھپ نکال دے!“

بچوں کی کھلکاریاں سن کر بوڑھے بڑ کی خاموشی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔
 سینکڑوں بچے باری باری یہاں آتے ہیں۔ ”چھوٹے بچوں کو میرے پاس
 آنے دو، بہشت کی حکومت ایسی ہی ہے!“ مسیح کا یہ قول میرے ذہن
 میں گونج اٹھتا ہے۔ سکول ماسٹر بچوں کو ڈانٹ کر کہتا ہے ”سبق کیوں نہیں
 یاد کیا؟ بوڑھے بڑ کے تلے چھلانگیں مارنے سے کیا حاصل؟“ بچوں کو یہ
 ہدایت بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ ساریوں سے وہ سورج کے لئے نقیض ’لوٹی‘
 اور لنگوٹی کا پیشکش لئے حاضر رہے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ وہ جاڑے میں ذرائع
 چمکے اور بچوں کے ارد گرد اپنی گرم کرنوں کا جال بن دے۔

بوڑھا بڑا ایک مت شاعر کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ کسانوں کے نعروں کا
 وہ پُرانا سر پرست ہے۔ دھرتی کے بیڑوں کی امیری غریبی کا وہ چشم دید گواہ
 ہے۔ شاید وہ اُن کے دلوں کی باتیں بھی سمجھتا ہے۔

پہلے گاؤں، بڑے گاؤں

گاؤں ہریالا ٹوٹ

کھڑے سن، راہبیا!

تیری رُوح ہو جوگی ٹوٹ!

— پہلے گاؤں ہے، بڑے گاؤں ہے، سرسبز شہنشاہت بھی بگاڑا ہے کھڑا

ہو کر شن، اور ابی، تیری رُوح کو سکون نصیب ہو جائے گا۔

”بڑھپاں دے گیت سُن کے

میرے دل وِج چاٹن ہو نیا“

— ’درختوں کے گیت سُن کر میرے دل میں روشنی ہو گئی۔‘

مست ہوا میں، جادو بھری فضا میں، جب بسنت کی دیوی لہجائی
ہوئی نگہ ہوں سے ایک ایک درخت اور پیر پلو دے کی طرت چھوٹی اٹھاتی
چل آتی ہے، دھرتی کی رگ رگ میں مدھ بھرا سناٹ سا جاتا ہے۔
خود فراموشی کے عالم میں شاید ہر ایک درخت کچھ نہ کچھ گنگناتا ہے۔

پُر سکون لمحوں میں پتوں کی معمولی سی سرسراہٹ سُن کر بھی راگبیر براکٹر
درخت کی دلی کیفیت واضح ہو جاتی ہے، درختوں کی صحبت میں اُن کی خفا
سرسراہٹ سے متاثر ہو کر آدمی ہمیشہ دھرتی کے دلی بھید پالیتا ہے۔

نہ تنہا آدمی بھلا نہ تنہا درخت۔ گاؤں کا شاعر ہمیشہ اپنی لئے دیتا آیا ہے :-

”کئی ہورے نہ بنن وِج ٹاہلی

کلا نہ ہورے پنت جٹ دا!“

— ’خدا کرے شیشیم کا درخت بھی جھٹل میں اکیلا نہ ہو اور نہ کسی کسان کے

بیٹا اکھوتا ہو۔‘

”بیریاں نوں بیر لگ دے

نیووں کچھ نہ لگا مٹیا رے!“

— 'بیر کے دختوں پر پھل آتا ہے۔ ارمی دوشیزہ تجھے کوئی پھل نہ لگاؤ۔

"رُت یاریاں لُون دی آئی

بیریاں دے بیر پکت گئے!"

— 'اب وہ رُت آگئی جب آپس میں مجتہدیں پیدا ہوں گی۔ بیرلوں

کے بیر پکت گئے!"

"مینوں کھلی نون چُبارہ پادے

روہی والا جند دُڈھ کے!"

— 'میرے لئے الگ چو بارہ بنوا دو۔ بیابان میں جو جند کا پیڑ کھڑا

ہے، اُسے کاٹ کر (شہتیر بنالیں گئے)۔

"بہڑے لا تروینی"

چھادیں بہہ کے کشیا کروں؟

— 'آگن میں ایک ساتھ تین دخت لگاؤ ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر

میں چرخہ کا تا کروں گی!"

"تھڑیاں باہج نہ سوہندے پھل

مچلاں باہج مچلا ہیاں

ہتاں نال مچیاں سوہندیاں

بنداں نال گھرائیاں

دھن بھاگ میرے آکھے پتل
کڑیاں نے پیٹھاں پائیاں
ساؤن وچ کڑیاں نے

پیٹھاں آسمان چڑھائیاں !

— نہ چبوتروں کے بغیر پیل سہاؤ نے معلوم ہوتے ہیں، نہ بچوں
کے بغیر پھلاہی کے پیر۔ بس کے ساتھ سمیل بھلی لگتی ہے اور بند کے ساتھ
گجرائی۔ پیل کہہ رہا ہے۔ 'میری خوش قسمتی ہے کہ نوجوان لڑکیوں نے مجھ
پر جنورے ڈالے ہیں، ساؤن میں لڑکیوں نے اپنے جنورے آسمان کی
طرف بڑھانے شروع کر دیئے۔'

'بڑھا! بڑھا! طوطا بویا۔'

'اگے تیری زمی بھیر دی'

'اگے تیرا مٹھ پڑانا!'

'دھیری زمی بھیر دی'

نہ میرا مٹھ پڑانا

'اگے کھا دا نواب دیاں ڈاچیاں

'اگے شتیر کپ کھڑے ترکھاناں

”میرا بھی“

ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا لطیف جذبہ قائم ہے،
اور یہ رشتہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ زمین میں جکڑے ہوئے درختوں کی رگوں
میں بھی لہو دوڑ رہا ہے، کبھی تیز رفتار سے، کبھی آہستہ آہستہ — آدمی کے
لہو کی طرح۔

ہمارے بوڑھے بڑا کی جڑیں دھرتی کی نبض پہچانتی ہیں۔
کتنی لا انتہا ہے زندگی کی وسعت! آدمی اور درخت دونوں دھرتی
کے بیٹے ہیں۔

بوڑھا بڑا ایک جہاں دیدہ اور ذمی جس دانا کی طرح کھڑا ہمارے گاؤں
کو تک رہا ہے۔

میری زندگی کا ایک سبق

ہمارے گھر میں جب بھی کسی کی موت واقع ہوتی، میری آنکھوں سے آنسو نہ گرتے۔ سب مجھے پتھر دل خیال کرتے۔ مگر اپنے اُس دوست کی موت نے جیسے برسوں کے جمع کئے ہوئے آنسو اُنڈیل دیئے۔

دیہاتی ناچ کا ایک گیت، جو میں نے اپنے گاؤں میں سنا تھا، میں نے اسے کئی بار سنا یا تھا۔ قبر اُڑیک دیاں، جیوں پتراں نول وال! یعنی قبریں انتظار کر رہی ہیں جیسے مائیں بیٹوں کی راہ دیکھا کرتی ہیں! اور ماں کے ساتھ قبر کی اس تشبیہ کی تعریف کرتے ہوئے میں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ ایک بے مثال خیال ہے اور دنیا کے ادب میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔ حالانکہ یہ وہ بھی جانتا تھا کہ میں یوں ہی جذبات کے لیے براثر

یہ بات کہہ رہا تھا۔

جس دن اُس کی موت کی خبر پہنچی مجھے فوراً اُس گیت کا خیال آیا، اور میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اُس نے کبھی کھل کر یہ کیوں نہیں بتا دیا تھا کہ وہ قبر کو اپنی حقیقی ماں سے کہیں بڑھ کر سمجھنے لگا ہے اور جلد اُس کی گود میں جا سونے گا۔

اُس کا گھر قصور میں تھا۔ ہم مندر را کالج پشوالہ میں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔ سنگیت میں اُسے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے شہر کے کسی گویٹے سے اُس نے کئی پتے راگ بیکھر رکھے تھے۔ ماصرانہ کرنے پر وہ اکثر کوئی چیز گانے لگتا۔ اُس نے اچھا گلا پایا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آواز ہنسی کی لے سے بل کر رہی ہے۔ جب وہ کلاؤنٹ کی طرح راگ کی الاپ شروع کرتا تو میں ہنسی نہ رک سکتا۔ سوچتا کہ یہ صرف راگ ہی نہیں ہے۔ بلکہ گلے کے ساتھ کشتی لڑنے کا مظاہرہ بھی ہے۔ ایک دو بار میں نے اپنی طنز ظاہر بھی کی۔ اس کا جواب اُس کے پاس ایک ہی تھا۔ تم پتے راگ کی اہمیت کیا جانو؟ تمہیں تو گنواروں کے گیت ہی پسند ہیں! گرمی کی چھٹیوں کے بعد کالج میں آیا تو پتہ چلا کہ وہ ابھی نہیں لڑا۔ گھر پر بیمار ہے، اور پھر معلوم ہوا کہ اُس نے کالج بدل لیا ہے اور اب لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی کالج کا طالب علم ہے۔

مجھے بھی قبض رہنے لگا۔ یا بہ کئے کہ میں سمجھنے لگا کہ مجھے قبض رہنا چاہیے! میرا رنگ کچھ کچھ زرد ہونے لگا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا اور دل میں کہتا کچھ کچھ زرد تو ہو چلا ہوں۔ اگر گھر جا کر پتا جی سے کہہ دوں کہ پٹیا لہ کا پانی مجھے راس نہیں اور لاہور جانے کے لئے اصرار کروں تو شاید میں بھی ڈی۔ اے۔ وی کالج میں داخل ہو جاؤں۔

پتا جی نے خرچ بڑھ جانے کا مسئلہ چھیڑا مگر میں نے ایک نہ مانی۔ وہ میری جند سے واقف تھے۔ پھر جب کالج بدلنے پر پتہ چلا کہ وہ لڑکا بدستور بیمار ہے اور ابھی گھر سے نہیں لوٹا تو ایک عجب بے کلمی سی رہنمائی کی۔ اور جب موت کی خبر پہنچی تو میری روح پر ایک بوجھ سا آ پڑا۔

پڑھائی میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ کالج میں پہلی دھچکیاں موجود تھیں۔ مگر وہ سب رونق مجھے بے جان معلوم ہوتی تھی۔ میرے کمرے میں اب پہلی سی صفائی بھی نہ رہی تھی۔ کئی ماد اسی طرح گزر گئے۔

کبھی کبھی میں پنجابی شاعری کا وہ عام ٹکڑا جے میں نے پہلے پہل سیکھا تھا: میرا پیچھو کرے کی زبانی سننا تھا، انگٹا نے لگنا:

”مقل کہے میں سب توں دڈی دڈی دڈی پکھری لڑی

شکل کہے میں تیجھوں دڈی میرا دنیا پانی بھری

دولت آکھے تنہوں دی دڈی میں نہیں کہے توں دڈی

موت کے نہیں تھے جھوٹیاں میں جو چاہاں سو کر دی!

— عقل کہتی ہے — میں سب سے بڑی ہوں میں کچھری میں بخت

کرتی ہوں۔ خوبصورتی کہتی ہے — میں تجھ سے بھی بڑی ہوں۔ دنیا میری غلام ہے۔ دولت کہتی ہے — میں تجھ سے بھی بڑی ہوں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ موت کہتی ہے — تم تینوں جھوٹ بولتی ہو۔ میں جو چاہاں دہی کروں۔

میں کالج جاتا ضرور مگر صرف وقت کاٹنے کے لئے۔ پڑھائی تو پڑھائی، مجھے تو ان دنوں زندگی ہی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ بے معنی ہی نہیں بے بڑ بھی۔ موت کا راز کیا ہے؟ بدھ نے اس کے متعلق کتنا سوچا تھا۔ اور اس کے پیرو تو کہتے ہیں کہ اُس نے اسے پایا تھا مگر موت سے تو وہ بھی نہ بچ سکا پھر وہ موت کا راز آخر کتنا کیا جسے اُس نے پایا تھا؟

امتحان میں میں اُس سال پاس ہو گیا۔ یہ کچھ خوشی نہ تھی۔ کبھی سوچتا کہ کالج چھوڑ کر بھاگ جاؤں اور آوارہ ہو کر ملک کا کو نہ کو نہ چھان ماروں۔ زندگی کی یہ سب ذمہ داریاں کیوں اتنی ضروری مان لی گئی ہیں؟ اور پھر ایک دن موت آتی ہے، اور وہ سب پائیاں جن میں آدمی رنگ گھولتا ہے اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ خرچ کر ڈالتا ہے، اپنے حلق میں اُنڈیل لیتی ہے جیسے زندگی کا سب رس ٹوکھ گیا ہو، میں ہنس نہ سکتا تھا۔ آکھ سے بھینا کم۔ دل سے سوچتا زیادہ۔ اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ زندگی اک الجھن کے سوا

کچھ نہیں..... جو لوگ خودکشی کر لیتے ہیں یہی ثبوت دیتے ہیں ناکہ انہوں نے اس حال میں پھنسے رہنا منظور نہیں کیا..... وہ کیا بُرا کرتے ہیں؟..... اور اگر میں بھی خودکشی کر لوں.....

شرارتی لڑکوں کی چھٹیں مجھے سرے سے ناپسند تھیں۔ نیند کے دھارے میں بھی یہ چھٹیں مجھ تک پہنچتیں اور میں اُن کی طرف سے کان بند کر لینا چاہتا۔ دُنیا میں کتنے بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ آخر کس لئے؟ یوں کالج میں آکر چھٹیں مار مار کر وہ کیوں کسی بھلے مانس کے کان کھا ڈالتے ہیں! ٹیگور کا وہ خیال کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ پیغام لاتا ہے کہ ابھی تک خدا دُنیا کی تخلیق سے مایوس نہیں، میرے ذہن میں گونج اُٹھتا۔ کب مایوس ہو گا خدا؟ اور کیا خدا سچ مچ کہیں ہے بھی؟ اکثر مجھے بڑے بوڑھوں کا وہ طنز آمیز فقرہ یاد آتا جو وہ بچپن میں کچھ اس طرح کی شرارتیں کرنے والوں پر کسا کرتے تھے۔ کیوں بے! پیدا ہوا تھا یا یوں ہی دھرتی سے اُگ آیا تھا؟ اور پھر مجھے کالج کے شرارتی لڑکوں پر ترس آنے لگتا۔ وہ نا سمجھ ہیں۔ سمجھ آ جائے سی..... اُن میں سے بھی ایسے بیویں لڑکے نکل آئیں گے جو میری طرح خودکشی کا خیال سُختہ کر لیں.....

یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے :

میں نیلا گنبد کے چوک میں اکھڑا ہوا۔ اب یہاں گہما گہمی نہ تھی۔ رات

انارکلی کی طرف سے ایک فوج ان آتا دکھائی دیا۔ وہ میرے پاس سے گزر گیا۔ مگر چھوٹ آیا۔ جیسے اُس نے میرا راز بھانپ لیا ہو۔
بولتا۔ ”کیا بات ہے؟“

کچھ نہیں۔

”تو بھی؟“

”اپنا کوئی دوست نہیں غمگسار نہیں۔“
”میں تو ہوں۔“

اُس کی بڑی اور روشن آنکھوں میں میں نے انسانی ہمدردی کی جھلک دیکھ لی۔ اُس کی آواز نے بھی مجھ پر اڑ کیا۔ اُس کا لباس میری طرح سادہ تھا۔ وہ بولا ”میرے ساتھ چلو گے؟“

میں اُس کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ جیسے اُس نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا تھا۔ راستے میں وہ پہلے خاموش رہا۔ پھر اُس نے پوچھا "آخر تم اتنے اُداس کیوں ہو؟" "میرے دل میں بہت پریشانی رہتی ہے۔ میں اس زندگی کے کچھ معنی نہیں سمجھتا اور میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کھیل ختم کر ڈالوں۔"

سائیکل کھرا کر کے وہ مجھ سے انگلیز ہو گیا۔ جیسے وہ میرے خیال کی داد دے رہا ہو اور خود بھی کسی دن خودکشی کرنے والا ہو۔

ہم آگے بڑھے۔ خاموشی نے ہم دونوں کے ہونٹ سی دیئے۔ وہ کون تھا، یہ میں نے اب تک نہ پوچھا تھا۔ میں کون ہوں، اُس نے بھی تو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ ہم صرف دو آدمی تھے بغیر کسی لیبل کے۔

اُس وقت وہ میرا مرحوم دوست بھی آتا تو شاید مجھے پہچان نہ پاتا۔ میں ایک نیا آدمی تھا۔

چلتے چلتے ہم میکلوڈ روڈ پر جا پہنچے۔ یہ سڑک میں نے بیسیوں بار دیکھی تھی۔ اُس خاموشی میں وہ کتنی متین تھی، کتنی پرسکون۔ وہ نوجوان آگے آگے جا رہا تھا اور میں اُس کے پیچھے پیچھے۔

ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ یہ کس کا گھر تھا، مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ اُس نے مجھے برآمدے میں ایک بیچ پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود اندر چلا گیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ایک بزرگ صورت آدمی کے ہمراہ باہر آیا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آداب بجالایا۔

میں کہاں ہوں؟ کس کے ساتھ کھڑا ہوں؟ یہ سوالات اُس وقت میرے دل میں جب نہ پاسکے۔ میں صرف ایک آدمی تھا۔ اور میرے سامنے

دو آدمی بیٹھے تھے جن میں سے ایک کو بزرگ صورت تھا، آداب بجالانے میں اس حق بجانب تھا۔

نوجوان نے اس بزرگ کو میری حالت بتا دی ہوگی، یہ میں سمجھ گیا۔ میں گھبرایا نہیں۔ میرے ماتحتوں کا سب سے ضروری سوال تھا موت کا راز۔ میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے متعلق مجھ میں ایسے بیسیوں تاثرات اٹھتے رہتے تھے جنہوں نے سچ مچ مجھے دلیوانہ بنا ڈالا تھا۔ موت کے بعد بھی زندگی کا سلسلہ ٹوٹنا سھوڑا ہوگا۔ اور اس کے بعد کی حالت اس موجودہ حالت سے اچھی ہی ہوگی..... اور اگر نہ ہو تو بھی کونسا گھانا پڑ جائے گا؟..... اور میرا فیصلہ جھٹ خود کشی کے حق میں اور بھی پختہ ہو جاتا۔

وہ بزرگ بولا: اچھا تو تم خود کشی کرنے جا رہے تھے؟
 ”ہاں“ صاحب!

اس کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا، میں کچھ نہ جانتا تھا۔ میں چپ بیٹھا تھا اور وہ نوجوان بھی اس بزرگ کی بغل میں چپ بیٹھا تھا۔ وہ بزرگ پھر میری طرف مخاطب ہوا: اچھا تو تم خود کشی کا ارادہ اب بھی رکھتے ہو؟

میں چپ رہا۔ جیسے میں کوئی مجرم تھا۔ حوصلہ کر کے میں نے دھیرے

سے کہا۔ ”کچھ کچھ۔“

وہ مسکرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں سچ مچ ایک مجرم ہوں۔ اور یہ صرف اُس کی عنفیت ہے کہ میرے تختہ مارنے کی بجائے وہ صرف مسکرا رہا ہے۔ پھر وہ بولا: ”تمارا مذہب؟“

میں چُپ تھا۔ میں مذہب کی قید میں نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ طالب علم کی زندگی کے لئے مذہب کے قافیہ اور روایت کی چنداں ضرورت نہیں۔ اُس نے کہا: ”تم کچھ جواب نہ دو گے تو میں تمہیں اپنی بات کیسے سمجھاؤں گا؟“

ہاں تو بتلاؤ کہ تم مسلمان ہو، ہندو یا عیسائی؟“
میں نے بتایا کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔
”تو تم مسئلہ تنازع میں تو یقین رکھتے ہو؟“
”کچھ کچھ۔“

وہ پھر چُپ ہو گیا۔ میں اُس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سمجھا کہ میں کسی بضر کے سامنے بیٹھا ہوں اور وہ میری رہنمائی کرنے چلا ہے۔ دل میں اب پہلی بے کلمی نہ تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ میری زندگی کا ایک اچھا دن ہے۔

وہ بولا: ”اس مسئلہ کے مطابق مرنے کے بعد تمہاری تین حالتیں ہو سکتی ہیں

یہاں وہ ذرا رک گیا۔ میں نے سوچا۔ یہ آدمی ضرور ایک بڑا عالم ہے اور اس کے قدموں میں یوں بیٹھ کر زندگی اور موت کا گہرا راز پالینا میرے لئے ایک فخر کی بات ہے۔

”..... یا تو تم اس صورت سے بہتر صورت پاسکتے ہو۔ یا بالکل لسی ہی..... اور یا پھر اس سے بھی خراب.....“

میں دھیان سے سن رہا تھا۔

”..... تو گویا بہتر زندگی پانے کی ایک تنہائی اُمید ہی رہ جاتی ہے..... اور پھر خود کشی کی تکلیف!..... نہیں، بھائی، نہیں.....“

اس تھوڑی سی موہوم اُمید پر میں تو کبھی مرنا پسند نہ کروں.....“

نیں ایک نیا آدمی بن گیا۔

اب میں مجرم نہ تھا۔ اس بزرگ نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں جینا چاہتا تھا۔ موت کے بعد زندگی کے متعلق میرے شکوک و شبہات بیدار ہو گئے۔ آداب بجا لا کر میں نے اجازت لی۔ وہ نوجوان مجھے دروازے تک پہنچانے آیا۔ میں نے احسان مندانہ نگاہ سے اُس کی طرف دیکھا۔

اور آہستہ سے اُس نے میرے کان میں کہا ”آپ شاعر اقبال ہیں؟“

”کوئی بات ہو جس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام آجائے رُوح میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اُن کی زندگی کا کوئی واقعہ جس میں گویا وہ سامنے کھڑے یا بیٹھ بولے باتیں کرتے

دکھائی دیں اُن لوگوں کے لئے جنہیں اُن کی ملاقات کا شرف حاصل تھا، ایک بڑی آسمانی نعمت تھی۔ جب دیوند رستیا رتھی صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا، مجھے وہ دن یاد آگئے جب مجھے بھی یہ فخر حاصل تھا کہ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کی محبت سے فیض پاؤں۔

ہر شخص کے لئے بڑے آدمیوں کے لئے، گناہ آمیز آدمیوں کے لئے، اُن کا مددگار ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا۔ جو اس دروازے سے واپس آتا، دل میں ایک دولت لے کر واپس آتا۔ رستیا رتھی صاحب کا یہ نفاذِ انصاف سننے اور حقیقت کو روبرو دیکھ لیجئے!

بشیر احمد

”ہمایوں“ اپریل ۱۹۴۱ء

برہمچاری

پنج ترقی کی وہ رات مجھے کبھی نہ مجھو لے گی اور پہلے کسی پڑاؤ پر سورج
 کنارہی نے اتنا سنگار کیا تھا، نہ پہلے وہ گیس کا لیمپ جلایا گیا تھا۔ اس روشنی
 میں سورج کنارہی کا عروس لباس کتنا سحر کربلا نظر آتا تھا۔
 دو نول گھوڑے دانوں کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ ایک کا نام تھا سوبریا
 اور دوسرے کا نہ فیح۔ جے چند کا کشمیری کلر جیا لال بہت مسرور نظر آتا تھا۔
 خود جے چند بھی دولا بنا بیٹھا تھا۔ روسینے کو نہ جانے اس محفل میں کچھ شش
 کیوں نہ محسوس ہوئی۔ کام سے فارغ ہوا تو یاترا کا بازار دیکھنے چلا گیا۔

پریم ناٹھ سے بغیر کچھ کہنے ہی جب میں سری نگر سے پیدل ہی پہنچا،
 کے لئے چل دیا تھا، تب کے خبر تھی کہ اتنے اچھے خیمے میں جگہ مل جائے گی۔
 سورج کماری نے میرا بھیدا پایا تھا۔ اُس نے جے چند کو بتا دیا کہ میں گھر
 والوں کی رضا مندی کے بغیر ہی اُدھر چلا آیا ہوں۔ اس طرح اُس نے میرے
 لئے اپنے خاندان کی ہمدردی اور بھی اُبھار دی۔

جیالال نے عزیز اسے وہ گیت گانے کا مطالبہ کیا جس میں ایک کنواری
 کہتی ہے — ”بیدِ مُشک کی خوشبو میرے من میں بس گئی ہے۔ باورے
 بھونرے! تو کہاں جا سویا ہے؟“ اُسے یہ گیت یاد نہ تھا۔ اُس نے سوچا ہوگا
 کہ وہ لڑکی جس کے من میں بیدِ مُشک کی خوشبو بس گئی تھی، سورج کماری
 سے کہیں بڑھ کر سُندر ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمیر کی بیٹی کو اکثر بہت
 خوبصورت لباس نصیب نہیں ہوتا۔

خود سورج کماری نہ جانے کیا سوچ رہی تھی، مجھے اُس کا وہ رُوپ
 یاد آ رہا تھا جب وہ ہر ادو پٹہ اوڑھے گھوڑے پر سوار تھی اور چند دن واڈی
 پار کر کے برف کے اُس پُل پر اتر پڑی تھی جس کے نیچے سے شیش ناگ
 بہہ رہا تھا۔ تب وہ جنگل کی افسر معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں جنگلی پھول
 چن کر چلتے چلتے جیالال نے ایک گجراتیا رکریا بٹھا اور وہ مسکراہٹ
 مجھے کبھی نہ بھٹو لے گی جو کہ جیالال سے یہ گجراتیا لیتے ہوئے سورج کماری

کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی تھی۔

میں نے کہا ”گیت تیار کرنا بہت مشکل کام تھوڑا ہی ہے۔ الفاظ کو ہنسی میں سے گزار دو، گیت ہو جائے گا۔“

سورج کمار می ہولی۔ میرے پاس تو پڑا اثر الفاظ بھی نہیں رہ گئے۔ ہل ہنسی میں نے سنبھال کر رکھ چھوڑی ہے۔ کبھی مجھے بھی شعر و نغمہ کی دُھن لگی تھی۔“

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن اپنے ذہن میں اُس سے مخاطب ہوا۔ گھبرا نہیں، مدہوش دُھن، تیرے بول تو بہت سُرِیلے ہیں۔ وہ ضرور کسی دن پھر بھی ہنسی میں سے گزریں گے۔ اور اپنے گیتوں میں تو مجھے بھول تو نہ جائے گی۔

عزیزانے لہجہ دار آواز میں گانا شروع کیا :

”لج پھلے اندون

چ کنن گئے نامے اون؟

لج پھلے کول سرن

وو تھو نہیرن کھس وو

پھولی یوسن اندون

چ کنن گئے نامے اون؟“

۔ دُور جنگلوں میں پھول کھل گئے۔ کیا میری بات تیرے کانوں تک۔
 نہیں پہنچی؟ کوئلہ جیسی جھیلوں میں پھول کھل گئے۔ اُٹھو ہم چراگاہوں
 کی طرف چڑھیں گے۔ دُور جنگلوں میں چنبیلی کے پھول کھل گئے۔ کیا میری
 بات تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟

جے چند کشمیری خوب سمجھتا تھا۔ کشمیر میں ٹھیکیداری کرتے اُسے کئی سال
 ہو گئے تھے۔ سُرُج کماری نے کہیں اس زبان میں دلچسپی نہ لی تھی، اس بات
 پر سب سے زیادہ جہرت مجھے اُسی رات ہوئی۔ جے چند بولا، کیسی کنواری
 کا گیت ہے۔ اُس نے دیکھا کہ بہار آگئی۔ چنبیلی کے پھول بھی کھل گئے۔
 اور پھر شاید غیر شعوری طور پر اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ خود بھی چنبیلی کا ایک
 پھول ہے۔

گیت کا ایک ہی ریلا عزیز اکو میرے قریب کھینچ لایا۔ سارے راتے
 میں کبھی میں نے اُسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ آدمی کتنا چھپا رہتا ہے۔
 اُسے جاننے کی میں نے اب تک کوشش بھی تو نہ کی تھی۔

روز روز کے لمبے سفر سے ہم بہت خنک گئے تھے۔ اب اس نخل میں
 سب تھکاوٹ بھول گئی۔ سُرُج کماری کا سُندر چہرہ و سامنے نہ ہوتا تو عزیز اکو
 بہار کا گیت نہ یاد آیا ہوتا۔

سُرُج کماری کہہ رہی تھی۔ بابو جی! میں نے سنا ہے کہ اس وادی میں

بننے والی پانچوں ندیوں کا پانی، جو اتنا قریب قریب بہتا ہے ایک دوسری سے کم و بیش ٹھنڈا ہے۔

جے چند بولا: ”شاید یہ ٹھیک ہو۔“

”میں سوچنے لگا کہ سب مرد بھی تو ایک سی طبیعت کے مالک نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ عزتیں بھی طبیعت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔ واہری

قدرت، پہنچ ترقی کی پانچوں ندیوں کا پانی بھی یکساں ٹھنڈا نہیں!

”پاربتی ان ندیوں میں باری باری سے نہایا کرتی تھی، بابو جی!“

”تم سے کس نے کہا؟“

”جیالال نے“

جیالال چونک پرآ۔ سورج لکھاری نے عیش طلب مہنسی ہنس کر جے چند کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ خود بھی ایک پاربتی ہو، اور اپنے شو کو رجھانے کا بہن کر رہی ہو۔

”میں نے عزیزا سے کوئی دوسرا گیت گانے کا مطالبہ کیا۔ وہ بھگ رہا تھا:

”دوئی دئی آرو لن یا رکئی مے لکھنا؛

چھوہ لوگم مس ولن یا رکئی مے لکھنا؛

دئی طیند زیننی یا رکئی مے لکھنا؛“

— ”آرو ل کے پھولوں میں ہمیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے

نہیں (میرے) محبوب؛ میرے بال بال کو خود سے نفرت ہو گئی ہے کہیں
تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب؛ سندھ نالے کے پانیوں پر تمہیں تلاش
کروں گی۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب؛

رفیع اُس درخت کی طرح تھا، جسے جھنجھوڑنے پر اونچی ٹہنی پر لگا ہوا
پھل نیچے نہیں گرتا۔ اُس نے ایک بھی گیت نہ سنایا۔ لیکن جیالال کافی
اُچھل پڑا اور بغیر رسمی تقاضے کے اُس نے گانا شروع کیا:

”پوری یار چلے تائے، تہی ماڈے اوٹھ وون؛

تہی ماڈے اوٹھ وون؛

دُورن مارن گرائے لول، گرائے لول!

وہتی وی دگ نیا و رو دہائے کرونے

سگر مالن چھائے لول۔ چھائے لول!

— ”میرا محبوب چوری چوری بھاگ گیا۔ کیا تم نے اُسے دیکھا ہے

کہیں، دیکھا ہے کہیں؟ — کان کے سبزے ہلاتے ہوئے، ہلاتے

ہوئے! اُٹھو پرلیو! ہم ”رو“ ناچ ناچیں گے، پہاڑیوں کی چھاؤں میں۔“

چھاؤں میں!

جیالال مسکرا رہا تھا۔ شاید خود ہی اپنے گیت پر خوش ہو رہا تھا۔

سُورج کماری کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنا بے کار نہ رہا۔ وہ

اُس کی زبان نہ سمجھتی تھی 'داد نہ دے سکتی تھی۔ لیکن اُسے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

سورج کماری کی مسکراہٹ میں کتنی مہنی تھی۔ وہ کالی داس کی کسی حُسن و عشق کی نظم کی طرح تھی جس میں الفاظ ایک سے زیادہ معنی پائے اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اس کی مسکراہٹ جے چند اور جیالال کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

مگر میں اس مایا میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنشد کی پُرانی کہانی "کچ دیویانی" میری آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ سورج کماری شاید دیویانی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ میں بھی کسی کچ سے کم نہیں۔

اپنشد کا کچ سورگ کا رہنے والا تھا۔ میں اسی دھرتی کا۔ یہی فرق تھا۔ وہ دھرتی پر ایک رشی کے آشرم میں زندہ جاوید رہنے کی ودیا سیکھنے آیا تھا، اور میں نے یا ترا کے دن کاٹنے کے لئے جے چند کے خیمے میں پناہ لی تھی۔ سورگ سے چلتے وقت کچ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ ودیا سیکھ کر واپس سورگ میں لوٹنا اور وہاں کے باسیوں کو اس کا فیض پہنچانا کبھی نہ بھولے گا۔ اس کے لئے سب سے ضروری یہی تھا کہ وہ برہمچاری کے دھرم پر برقرار رہے۔ رشی کسی کو یہ ودیا آسانی سے

سمکھاتا نہ تھا۔ کہتے ہی نوجوان اُس سے پہلے بھی آچکے تھے۔ ہر کوئی رشی کے غصے کی تاب نہ لا کر وہیں ختم ہو گیا۔ مگر جب کچ آیا تو رشی کی لڑکی دیویانی اُس پر شیدا ہو گئی تھی۔ اپنے باپ سے فرمائش کر کے اُس نے اُسے یہ ودیا سکھانے پر رضامند کر لیا۔ جب کچ یہ ودیا سیکھ چکا تو وہ واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دیویانی کہتی ہے۔ ”دیکھینا اس دینومتی ندی کوست بھولیو۔ یہ تو خود محبت کی طرح بہتی ہے!“

کچ جواب دیتا ہے ”اُسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔۔۔۔۔ اسی کے قریب اُس دن جب میں یہاں پہنچا تھا، میں نے تجھے پھول پھنتے دیکھا تھا اور میں نے کہا تھا۔ میرے لایق سیدا ہو تو کوہ“

دیویانی کہتی ہے۔۔۔۔۔ اہ اسی طرح ہمارا پیار شروع ہوا تھا۔۔۔۔۔ اب تم میرے ہو۔۔۔۔۔ عورت کے دل کی قیمت پچاؤ۔۔۔۔۔ پیار بھی کسی ودیا سے مستانہیں۔۔۔۔۔ اور اب تمام دیوتے اور ان کا بھگوان اپنی مشترک طاقت سے بھی تمہیں واپس نہیں لے سکیں گے۔۔۔۔۔ مجھے پھول پیش کرنے کے خیال سے میسیوں بارتم نے کتاب پرے پھینک دی تھی۔۔۔۔۔ ان گنت بارتم نے مجھے وہ گیت سنائے تھے جو سدا سُرگ میں گائے جاتے ہیں۔ تم نے یہ روئے مرن اسی لئے توانمیا کرنا کیا تھا کہ یوں مجھے خوش رکھ سکو اور آسانی سے وہ ودیا سیکھ لو جسے

میرے بھتیجی نے پہلے کسی کو سکھانا منظور نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔“
 کچھ کہتا ہے: مجھے معاف کر دے دیویانی!۔۔۔۔۔ سُرگ میں تو مجھے
 ضرور جانا ہے۔۔۔۔۔ پھر میں تو برہمچاری ہوں!“

”برہمچاری!۔۔۔۔۔ ایک راہی کی طرح تو یہاں آنکلا تھا۔ دھوپ تیر تھی
 چھاؤں دیکھ کر تو یہاں آ بیٹھا۔ پھول چن کر تو نے میرے لئے ایک ہار بنایا
 تھا۔۔۔۔۔ اب خود ہی اپنے ہاتھوں سے تو ہار کا دھاگا توڑ رہا ہے۔۔۔۔۔
 دیکھ، پھول گرے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔!“

”برہمچاری تو میں ہوں ہی، سُرگ میں ہر کوئی میرے انتظار میں ہوگا
 ۔۔۔۔۔ وہاں مجھے جانا ضرور ہے۔۔۔۔۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ جہاں تک میری
 ذات کا تعلق ہے اُس سُرگ میں مجھے اب شانتی نصیب نہ ہوگی۔“

میں نے سوچا کہ ایک لحاظ سے میں کچھ سے کہیں زیادہ محقول وجہ پیش
 کر سکتا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں، ”سورج کمار سی اتیری سکراٹھ صرف تیسے
 خاوند کے لئے ہونی چاہئے۔ دیویانی کی طرح تو کسی ریشی کی کنواری لڑکی
 محقوڑا ہی ہے۔“

سورج کمار سی انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ
 بائیں گال پر سرک آئی تھی۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولی، ”بس یا ابھی اُد۔۔۔۔۔؟“
 میں نے اُس کا پورا مطلب سمجھ بغیر ہی کہہ دیا۔ ”بس۔ اور نہیں۔“

”اور نہیں؟... خوب رہی! میں تو ادھر کی زبان سمجھتی نہیں۔ تمہاری خاطر بابو جی نے عزیز کو یہاں بلایا۔ اب تھوڑے سے گیت سن کر ہی تمہاری سبک دھڑکن لگ گئی؟ تو یوں ہی گیتوں کی رٹ لگا رکھی تھی پہلے کام میں؟...“
میں نے کہا ”نہیں بی بی جی، میں نے سوچا آپ کو نیند آ رہی ہے اور شاید عزیز ابھی سونا چاہتا ہے۔“

عزیز اکچھ نہ بولا اور بے چند نے محلِ رغاست کر دی۔ عزیز اور فریج چلے گئے۔ اور روسیہ اب بے چند اور سورج کمار کی کے بسترنگا کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔

سورج کمار کی پوچھ رہی تھی ”بابو جی! سنا ہے گپھا میں کبوتروں کا جوڑا بھی درشن دیتا ہے؟“

”صبح کو تم خود ہی دیکھ لو گی۔“

”یہ کبوتر کہاں سے آتے ہیں؟“

”اب یہ میں کیا جانوں؟“

”ایک سنان نے بتایا تھا کہ یہ کبوتر شو اور پارہتی کے روپ ہیں۔“

”شاید عورتوں کا وہ یہی کتا ہو۔“

روسیہ سوچکا تھا۔ بے چند اور سورج کمار بھی سو گئے۔ جیالال بولا۔

”اُف! کتنی سردی ہے!“

”کتنی سردی ہے! برہمچاری ہو کر بھی یہ سردی نہیں سہہ سکتے۔ شرم کا مقام ہے۔“

”برہمچاری تو میں ہوں۔ مگر اس آب و ہوا کا عادی نہیں ہوں۔“

”برہمچاری کو تو کسی بھی موسم سے ڈرنا نہیں چاہئے۔“

”تم بھی تو برہمچاری ہو۔“ اُس نے طعنہ مارا۔

”تو میں کب ڈرتا ہوں؟“

”تو کیا تم خیمے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سو سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں؟“

یہ بات میں نے ہوش میں آ کر کہہ دی تھی۔ میں نے اپنی موٹی کشمیری

لوئی اٹھائی اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ جیالال میرے پیچھے بھاگا۔ میں

ڑک کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ستانا تھا۔

وہ بولا، ”میں نے تو ہنسی میں کہہ دیا تھا اور تم سچ مان گئے۔“

”سچ ہو چاہے جھوٹ۔ میں دکھا دوں گا کہ برہمچاری ڈرتا نہیں۔“

”اچھا تو خیمے کے قریب ہی سو جاؤ۔“

میں خیمے کے قریب ہی لوئی میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ وہ اندر سے چٹائی

نکال لایا۔ بولا، ”اسے نیچے ڈال لو۔ ایسی تو کوئی شرط نہ تھی کہ ننگی دھرتی پر سو

کر دکھاؤ گے۔“

چٹائی ڈال کر وہ میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ بولا: "ارے یار! بھگت میں کیوں جان گناتے ہو؟"

"اُونہ۔" میں نے شانے پھر کاتے ہوئے کہا "مجھے کسی بات کا خطرہ نہیں۔" اچھا تو میں بھٹیکیدار صاحب کو جگاتا ہوں۔ جیالال بولا۔

پھر جیالال اُس مسلمان چرواہے کی کہانی سنانے لگا جس نے ایک بڑا کام کیا تھا۔ یا تری امر ناتھ کا راستہ بھول گئے تھے۔ اُس نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اور اُس کے عوض میں اب تک اُس کی اولاد کو چڑھاؤ کا ایک معقول حصہ ملتا آ رہا ہے۔

میں نے شرارتاً کہا: "وہ چرواہا ضرور اُس وقت برہمچاری ہوگا۔" وہ ہنس پڑا اور اندر جا کر لیٹ رہا۔ میں چاند اور تاروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پرانے زمانے میں بڑے بڑے ریشی ادھر آتے تھے تو خیموں میں تھوڑا ہی رہتے تھے۔ یوں کھلے آسمان تلے پڑ رہتے ہوں گے۔ اس کڑاگے کی سردی سے وہ ڈرتے نہ تھے۔

کچھ دیر کے بعد تارے میری نگاہ میں کانپنے لگے۔ چاند دھند میں لپٹ گیا۔ خواب آلود دیکھوں نے آنکھوں کو سی دیا اور میں نے دیکھا کہ جیالال گھوڑے پر سوار سورج کماری کو بھرپوش کر رہا ہے، اور وہ پشاور کی ہرے دوپٹے والی جوان عورت عجب انداز سے

مشکرا رہی ہے۔ میں نے جیالال کو متنبہ کرتے ہوئے کہا: ”جیالال! تمہارا
 نصیب العین عورت سے کہیں بلند ہے۔۔۔ عورت ایک الیوٹرن ہے۔۔۔ مایا!۔“
 جیالال ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا اور بولا: ”لیکن یہ
 مایا بھی کس قدر حسین ہے۔ مجھے اس سُر کے پیچھے سرگرداں رہنے دو۔“
 عزیزا بید مشک کی ہنسی لئے آ رہا تھا۔ میں نے مٹا اُس سے سوال کیا
 ”یہ کس کے لئے لائے ہو، عزیزا؟“

”اُس بہار کی دُلہن کے لئے جو خیمے میں اِس وقت مست خواب ہے۔“
 عزیزا نے نیم ہد ہوش آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 اُس وقت مجھے کسی سُورج کماری کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ گا رہی
 ہو۔۔۔ ”بید مشک کی خوشبو میرے من میں بس گئی ہے۔۔۔ دُور جگلوں میں
 چنبیلی کے پھول کھل گئے۔ کیا میری آواز تمہارے کانوں تک نہیں
 پہنچی، میرے محبوب؟“

اور جیسے کوئی جے چند کہہ رہا ہو: ”تمہاری آواز میں نے سُن لی، اُٹھو
 ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے۔“

پھر وہ سُورج کماری تیلیوں کے پیچھے بھاگی۔۔۔ جے چند بھی اُس کے
 ساتھ ساتھ رہا۔ سُورج کماری کو دیکھ کر مجھے اُس چینی کنوار سی کامیال آیا،
 جسے تیلیوں نے پھول سمجھ لیا تھا اور لڑکیاں بنا کر اُس کے گرد جمع ہو گئی

تھیں۔۔۔۔۔ مگر یہ تتلیاں تو سورج کماری سے بھاگ رہی تھیں اور اُن کا پیچھا کرتے اُس کا سانس چڑھ رہا تھا۔ جے چند کو دیکھ کر مجھے چینی تاریخ کے اُس بادشاہ کی یاد آئی جس نے پنجروں میں سینکڑوں تتلیاں پال رکھی تھیں جب اُس کے باغ میں خوبصورت لڑکیاں جمع ہوتیں تو وہ محکم دیتا کہ پنجروں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ یہ تتلیاں بلا کی سیانی تھیں۔ وہ سب سے خوبصورت لڑکی کے گرد جمع ہو جاتیں۔ اور اس طرح یہ لڑکی بادشاہ کی نگاہوں میں بھی جج جاتی۔۔۔۔۔ کیا اس جے چند نے بھی تتلیوں کی مدد سے اس سورج کماری کو چُنا تھا؛ پر یہ تتلیاں تو نہ سورج کماری کی پروا کرتی تھیں نہ جے چند کی۔۔۔۔۔

دوڑتی دوڑتی وہ سورج کماری ایک چرواہے کے پاس جا پہنچی۔ بلی ”بہسری پھر بجالینا۔ پہلے میرے لئے تتلی پکڑ دو۔“ وہ سُندر تتلی جو ابھی ابھی سامنے پھول پر جا بیٹھی ہے۔ ”شاید تتلی کی بجائے وہ اُس نوجوان چڑیلے ہی کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر جب اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو اُسے جے چند نظر نہ آیا۔

وہ بدستور گارہی تھی۔ ”کہیں تم ملو گے نہیں، میرے محبوب، آہول کے پھولوں میں تمہاری تلاش کروں گی۔“
کہیں سے کوئی جیا لال آ نکلا۔ بولا ”تو زگس ہے۔ خمار سے بھر لو۔“

تو شرم سے گردن جھکائے ہوئے ہے۔ اور وہ سورج کماری بولی: ”باورے
بھونڈے! میں تیرے انتظار میں تھی۔“

جے چند کو آتا دیکھ کر جیالال بھاگ گیا۔ ورنہ وہ بُری طرح ہڈتا۔ جے چند
بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ سورج کماری سر جھکائے کھڑی تھی۔ پاؤں کے
انگوٹھے سے وہ زمین کُریدتی رہی۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ مزید یہ کھیل نہ دیکھوں گا۔ اپنی لونی میں سمٹ کر
بیٹ گیا۔ سورج کماری کا خیال تک میرے دل میں نہ اُٹھے، بس یہی میری
کوشش تھی۔ مگر سورج کماری تھی کہ سامنے سے ہنستی ہی نہ تھی، میرے پاس
آ بیٹھی اور پُر معنی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُسے اپنے بالکل قریب
پاکر میں بہت گھبرا یا۔ اور میں نے چلاتے ہوئے کہا: ”عورت! — عورت مایا
ہے۔ اور پھر میں تو ایک برہمچاری ہوں۔“

اُس نے میرا سراپنے زانو پر رکھ لیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔
”نہ بابا! مجھے پاپ لگے گا۔“
”اور مجھے بھی؟“

”ہاں۔“

”پیار تو پاپ نہیں۔“

میں چپ رہا۔ وہ بولی: ”اب یاد آیا۔ جیالال سے گھبرالے کر میں نے

اُسے تھوڑی سی مسکراہٹ دے دی تھی۔ اُس دن سے تم کچھ تنے تنے سے رہنے ہو۔۔۔ تمہارے ہاتھ کس طرح شل ہو رہے ہیں! جانتے ہو؟
 ”ہو جانے دو“

”پاؤں نیلے ہو رہے ہیں!“

”ہونے دو۔ تم جاؤ۔“

وہ مجھے سہلاتی رہی۔ اُس کے بازو کتنے بڑا راحت تھے! اُن میں کتنی گرمجوشی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے بھینچنے لگی۔ میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہارتا جاتا تھا۔

کیا سچ مچ ہیں وہ دیا ہوں جس کا تیل کبھی ختم نہیں ہوتا، جس کی بٹی کبھی بجھتی نہیں؟ کیا عورت مایا ہے۔۔۔۔۔ سورج کماری بھی مایا ہے؟ اُس کے بازوؤں کی گرمجوشی اُس کی لمبی لمبی پکیں، اور اُس کے ابھرے ہوئے گال، کیا یہ سب مایا ہے؟ اس پیار سے خدا ناراض ہوتا ہے تو بوجاے۔ یہ بات تھی تو یہ صورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے۔ اوپر تارے جھللا رہے تھے۔ میرے ذہن میں پیار کے جذبات جاگ رہے تھے۔ میں نے کہا ”اپنے پریشان بال درست کر لو۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ سورج کماری! تم نے کتنی تکلیف کی۔ میں نے کہا، اس سردی میں تم یہاں بیٹھی ہو۔ خیمے میں چلی جاؤ۔“

وہ کچھ ندولی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہنسری میں سُر جاگ اُٹھیں گے.....
 ضروری نہیں ہے کہ ہنسری منہ لگانے ہی سے بچے..... ہوا بھی تو سر جگا سکتی
 ہے..... اور اُس کا گیت مجھے ہمیشہ کے لئے جیت لے گا۔

مجھے ایک پُرانی کہانی یاد آگئی۔ دیکھا کہ سامنے ایک آشرم ہے۔ میں آشرم کے دروازے
 کی طرف چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک سُندر کنواری کھڑی منہ بُور رہی ہے۔ اندر سے رشی نکلتا ہے۔
 پوچھتا ہے "کیا دکھ ہے تجھے دیوی؟" لڑکی کہتی ہے "مجھے سیرا چاہئے۔ رشی گھبرا جاتا ہے
 "سیرا!..." پر دیوی ایسا تو عورت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ لڑکی کہتی ہے "صرف آج
 کی رات۔ صبح ہی میں اپنی راہ لوں گی" رشی کہتا ہے "اچھا سامنے اُس کمرے میں چلی
 جا۔ اندر سے سانکل لگا لیجئے"۔ نصف رات گزر جانے پر رشی کی ہوس جاگتی ہے۔ وہ
 لڑکی کے کمرے کی طرف آتا ہے اور وارو کھٹکھٹاتا ہے۔ رشی دیوا یہ پاپ ہوگا۔ لڑکی اندر سے
 کہتی ہے "تم تو گویا میرے باپ ہو۔ وہ دروازہ نہیں کھولتی۔ رشی چھت پھاڑنے لگتا ہے۔
 پیشتر اس کے کہ وہ چھت پھاڑ کر اندر کو دنتا ہے، وہ سُندر کنواری اپنی
 عصمت بچانے کے لئے باہر بھاگ جاتی ہے..... پھر جیسے کسی نے تصویر
 اُلٹی لٹکا دی۔ میں نے دیکھا کہ رشی اپنے ہون کنڈ کے قریب سو رہا ہے۔ اور
 وہ سُندر کنواری اُس کے پاس آ بیٹھی ہے۔ اُس نے رشی کا سر اپنے زانو
 پر رکھ لیا ہے۔ رشی گھبراتا ہے بیچ کتاب کھاتا ہے مگر پھیلے اور سمٹتے تھے
 بازوؤں کی گرفت اُسے بھاگنے سے روکے رکھتی ہے.....

میرا جسم سردی سے اکڑ رہا تھا۔ اپنی ضد پر جھنجھلا نے کے لئے جس گرمی کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ دل سے باتیں کرتے کرتے میں پھر نیند کے دھارے میں بہہ گیا.....

میرا سینہ گرم ہو گیا تھا۔ گردن بھی اور شانے بھی۔ پیٹ بھی گرم ہو رہا تھا۔ پیٹ کی پخلی انترطریاں ٹھنڈے پانی سے نکل کر آگ کی طرف لپکنے والے بچوں کی طرح جدوجہد کر رہی تھیں۔ گردن کے پاس تو گرم اور خوشگوار خوشبو میں بسی ہوئی سانس لپٹ رہی تھی۔ زانو ابھی بے حس تھے جیسے وہ میرے نہ تھے اور پاؤں میں کسی نے سیدہ بھر دیا تھا۔ ٹھنڈا اور بھاری!

میں نے بونا بند کر دیا تھا۔ کون جانے یہ کیا چیز تھی جو میرے اندر بڑبچ رہی تھی۔ اس خیال کی آواز جسم کی ایک ایک گہرائی سے سُنی اُن سُنی سی اُٹھ رہی تھی۔ یہ کچھ ایسی حالت تھی جو سوتے سوتے چھاتی پر ہاتھ آپڑنے سے ہو جاتی ہے..... کوئی میرا دل کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے ایک انگڑائی لی۔ ہاتھ کی ٹھنڈی انگلیاں پیٹ پر آگئیں۔ اب یہ گرم تھا۔ زانوؤں میں بھی کچھ جنبش محسوس ہوئی اور یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ پاؤں بھی اب میرے جسم سے الگ نہیں۔

سُوج کاری بھی چُپ تھی۔ مگر جب اُس کے بازو مجھے بھینچنے کے لئے

پھیلتے اور سمٹتے تھے، وہ کنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی مگر اُس کے ہونٹ، جو دیر تک اُڑتے رہنے والے پرندوں کی طرح پر سمیٹ کر آرام کر رہے تھے، ہل کر رہ جاتے۔ ادھ سوئی سی اُس کی آنکھیں تھیں۔ جیسے گھنے جنگل کے سایوں میں کرنیں جھلما اُٹھتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں کسی قدر خاموش مسکراہٹ تھر تھرانے لگتی۔ اپنی آنکھیں میں نے اُس کی گردن کی طرف موڑیں۔ دیکھا کہ اُس کی رگیں مدہوش سی لیٹی ہوئی ہیں۔

زور سے شانے ہلا کر میں اُس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے لگا۔ کیا یوں دیکھنا گناہ ہے؟ کیا بوجھ یہ ہی سب سے اونچی چیز ہے؟ کیا اس کے لئے سب لطف چھوڑ دینا چاہئے؟ — یہ سب لطف جو خوبصورتی اگر جوشتی اور از خود رفتگی سے ہل کر بنا ہے؟

سُورج کماری جو پہلے کون جانے کس غنودگی میں ادنگھ ادنگھ جاتی تھی، اب شاید کسی سُننے کی راحت بخش چھاؤں کی بجائے خود زندگی میں تھرکنے والے پیار کا آئند لینا چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں، ہلکوں کی سیاہی ہیرے جوہرے دُور ہوتی گئی۔ میری آنکھیں کھُل گئیں۔ کچھ دیر تو نیلے آسمان کے گرد بکروں کا نظارہ رہا۔ ایک مست پھیلا ہوا نظارہ، پھر یہ نظارہ سمٹ کر سُورج کماری کی آنکھوں میں بدل گیا۔

میرا سر اُس کی گود میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ڈر گیا

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سورج کماری نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر پھیرا۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ خیمے کے اندر ہوں، پاؤں کے پاس انگلیٹی سلنگ رہی ہے، اور کئی اُداس چہرے میرے گرد جمع ہیں۔

دیکھنے کی قوت کے ساتھ ساتھ سننے کی قوت بھی ٹوٹ آئی۔ سنسکرت کے کچھ بول میرے کانوں میں پڑے۔ کوئی پنڈت جی میرے لئے پرارتھنا کر رہے تھے، اپنے آپ یا ان لوگوں کے کہنے پر۔

میں خاموش تھا۔ احسان مندی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اپنی ہٹ دھرمی پر شیمان بھی تھا۔ یہ دونوں خیال کافی دیر تک رہے۔ پھر کچھ شیطانی جذبے، جن سے ہماری زندگی قائم ہے، دھیرے دھیرے جا گئے۔ لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ہٹ دھرمی نہ ہوتی تو سورج کماری کی گود کا لطف اور سکون کیسے نصیب ہوتا۔ سورج کماری کی آنکھیں ایک ایک چمک اٹھیں۔ میں ڈرا۔ کیا اس نے میرے جذبات کا بھید پالیا ہے؟ شرم، بے بسی، خود فربہی اور نہ جانے کن کن چیزوں سے پیدا ہونے والی ایک مسکراہٹ میری مونچھوں ہی میں کہیں گم ہو گئی۔

سورج کماری نے لوگوں سے کہا: اب یہ ٹھیک ہیں۔۔۔۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ لوگ بستر وغیرہ سنبھالنے۔ امرنا تھ جانے کا وقت ہو گیا ہے!

لوگ اطمینان سے سفر کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ مگر پنڈت جی بدستور
 منتر پڑھے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ سورج کماری نے
 ایک بار پنڈت جی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مُنہ موڑ کر ایک للچائی سی
 ادا سے مسکرا کر کہا۔ ”اُٹھو، برہمچاری جی!“

تین گیت

اُس دن میرا ذہن اُس آسمان کی طرح تھا جس پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ بس ہوا چلنے کی دیر ہو اور سب بادل غائب ہو جائیں۔

تزویدی کشیک وقت پر آ پہنچا۔ میں نے اُسے بتایا ”میں تمہارے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ تم آنکھلے اور اس لحاظ سے تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔“
تزویدی ہنس کر بولا ”میں ان باتوں کا قائل نہیں۔“
وہ کاٹھیاواڑ میں بہت گھومنا پھرا تھا۔ وہاں کے بہت سے رگیت

اُسے زبانی یاد تھے۔ مجھے اُس سے بہت مدد مل رہی تھی۔ اُسے ایک بھی گیت یاد نہ ہوتا، اور گیتوں کا وہ شوقین بھی نہ ہوتا تو بھی ہمارے دوستی میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ وہ اکثر کہا کرتا "میرے پاؤں میں چکر ہے" اسے وہ ہم تصور نہیں کرتا تھا۔ اکثر وہ بتایا کرتا کہ کس طرح اسی کے زیر اثر وہ پرندے کی طرح اُڑتا رہا ہے۔ اُڑنے میں ہم ایک ہی سے تھے۔ شروع میں یہی بات ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔

گاڑی میں ہمیں کھلی جگہ مل گئی۔ ہم سا برستی جا رہے تھے۔ وہ بولا۔
 "آج میں تیسری بار سا برستی چلا ہوں"

پاس کی سیٹ سے ایک نوجوان بول اُٹھا "سا برستی؟ تب تو میں بھی آپ کا ساتھی ہوں"

"اچھی بات ہے" میں نے کہا "مجھے گاؤں کے گیت بہت جانتے ہیں۔
 اس معاملے میں بھی ساتھ دو گے؟"
 "خوشی ہے"

پتہ چلا کہ وہ کاٹھیا واڑ کا رہنے والا ہے۔ سمندر کے کنارے ایک گاؤں۔
 میں جہاں وہ پیدا ہوا، اُس کا بچپن گزرا تھا۔ اُسے وہ دن اب بھی یاد تھے جب کوئی بلند آواز سے گا اُٹھتا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی بادل گرج اُٹھا ہے.....

”ترویدی نے کہا ” اچھا تو ایک آدمہ گیت ہو جائے اور اٹھل رہے گا۔
 ”میں گاؤں کا ضرور مگر آپ کو بھی کچھ سنانا ہوگا۔“
 ”ضرور“

”جو گیت مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ ایک عورت کا گیت ہے۔“
 ”عورت کا؟“ ”کسی ٹنکھی عورت کا یا کسی ڈکھیا کا؟“
 ”اب یہ آپ دیکھ لیں گے۔ بے چاری ٹوٹے ہوئے تار سے کی طرح تھی،
 اُس نے اپنی جوت و کمانی اور پھر.....“
 ترویدی نے بات کاٹ کر کہا ”بس اب شروع کیجئے۔“

”اتنی کیا جلدی ہے۔ مجھے جو کہنا ہے وہ ضروری ہے، بہت ضروری
 ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ عورت ٹوٹے ہوئے تار سے کی طرح سنسار
 سے اوچھل ہو گئی۔ کہانی یوں ہے۔ بارہ سال بعد ایک سپاہی گھر لوٹا تو اُس
 کا دل اپنی بیوی سے ملنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ وہ گھر میں نہ تھی اُس
 کمرے میں ابھاں وہ فوج میں جانے سے پیشتر ہمیشہ سویا کرتا تھا، دیا جل رہا
 تھا.....“

ترویدی بولا ”اب اور نشریح ٹھیک نہیں۔ گانا شروع کیجئے۔“
 وہ نوجوان گانے لگا:

”مازی بار بار برسے آویو“

ماڑی فی دینی پاتلی پر مارے اجاڑی مایاں!

مولوں مایاں دیو شگ و لے رے!

— مایاں! بارہ سال کے بعد میں آیا ہوں۔ مایاں! کہیں نظر نہیں پڑی وہ

پر مارا راجپوتوں کی بیٹی! او مایاں! — ”جاڑیجا“ راجپوتوں کی بیٹی! محل میں ویلے
کی بچی جل رہی ہے!

”دی کرا بیٹھو ویسی نے ہتھیار چھوڑے، کلہا کنور!

پانی بھری ہنساں آوئے رے!

— بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اتارو۔ او میرے پر تپانی کنور! پانی بھر کر ابھی
آجائے گی وہ!

”ماڑی کو اُنے دلوویں جوئی لیورے

ماڑی نو دینی پاتلی پر مارے اجاڑی مایاں!

مولوں مایاں دیو شگ و لے رے!

— مایاں! کونیں اور باولیاں دیکھ آیا ہوں۔ کہیں نظر نہیں پڑی وہ پر مار

راجپوتوں کی بیٹی! او میری مایاں! — ”جاڑیجا“ راجپوتوں کی بیٹی! محل میں
ویلے کی بچی جل رہی ہے!

”دی کرا سہی ویسی نے ہتھیار چھوڑے، کلہا کنور!

دن دلی ہنسا آوئے رے!

”بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اتارو۔ او میرے پرتاپی کنور! (آنا) پس کر بھی
آجائے گی وہ!“

”ماڑی! گھنٹیوں نے رتھڑا جوئی دلیورے!“

ماڑی! نو دھٹی پاتلی پر مارے جاڑی بھی ماں!

مولوں ماں دیو شگ ولے رے!“

”ماں! چکیاں اور خراس سب دیکھ آیا۔ ماں! کہیں نظر نہیں پڑی

وہ پر مار راجپوتوں کی بیٹی۔ او میری ماں — ”جاڑی عجب“ راجپوتوں کی بیٹی!

محل میں دیے کی بتی جل رہی ہے!“

”دی کر! اہیٹی ویسی نے ہتھیار چھوڑے، اکلیا کنور!“

دہان کھاں زی نے ہماں آدھے رے!“

”بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اتارو۔ او پرتاپی کنور! دہان کوٹ کر ابھی آ

جانے گی وہ!“

”ماڑی! کھارنیاں کھارنیاں جوئی دلیورے!“

ماڑی! نو دھٹی پاتلی پر مارے جاڑی بھی ماں!

مولوں ماں دیو شگ ولے رے!“

”بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اتارو۔ او میرے پرتاپی کنور! کپڑے دھو کر ابھی

آجائے گی وہ!“

”ماڑی! اندیونے لئے اں جوئی دلہو رے!

ماڑی! نوڈیٹی پاتلی پر مار رے ہار بجی ماں!

مولوں میں دیو شگ رے رے!

— ’ماں! اندیاں اور نہریں دیکھ آیا ہوں۔ ماں! کہیں نظر نہیں پڑی وہ

پر مار راجپوتوں کی میٹی۔ او ماں — ’جاڑیجا‘ راجپوتوں کی بیٹی! محل میں دیے

کی جی جل رہی ہے!‘

”ایناں بچکا ماں کوری باندھنی رے!

اپنی باندھنی دیکھی نے بادد دہاؤرے گوجارن ماں!

مولوں ماں آمو موڑیو رے!

— ’اس گھڑی میں کوری ساڑھی پڑی ہے۔ اس کی اس باندھنی کو

دیکھ کر راجی چاہتا ہے (سادھو بن جاؤں۔ او ہتیار سی ماں! محل میں آم کا پیڑ

ٹکھا ڈالا گیا ہے!‘

”ایناں بچکا ماں کوری ٹیلوی رے!

اپنی ٹیلوی تانی نے ترسول تانوں سے گوجارن ماں!

مولوں ماں آمو موڑیو رے!

لے باندھنی لفظ کا ترجمہ ساڑھی کے ساتھ ٹیری بھی ہو سکتا ہے۔ ’باندھنی‘ کا مطلب منہوم ہے۔

”باندھ باندھ کر لگی ہوئی“

— اس گٹھڑی میں کوری ٹیلوٹی پڑی ہے، اس ٹیلوٹی کو کھینچ کر رچی میں آتا ہے کہ خود کشی کرنے کے لئے اترشول کھینچ لوں۔ اوہتیاری ماں! تو نے محل میں آم کا پیر سکھا ڈالا ہے۔

ترویدی، بولا: اس گیت کے متعلق میں نے سُن رکھا تھا۔ آج آپ کی زبان سے اسے سُن کر اور وہ بھی ٹھٹھک دیہاتی سروں میں، میرے دل میں یکبار پھر کاٹھیاواڑ کی سیر کرنے کا خیال بچنے ہو گیا ہے۔ میرے پاؤں میں تو جکڑ ہے۔ میں ضرور وہاں جاؤں گا اور خود کسان عورتوں کی زبان سے یہ گیت سُنتے ہوئے آپ کی یاد تو آئے گی ہی..... ہاں تو سپاہی سیانا نکلا موہ سجد گیا کہ اُس کی بیوی مار ڈالی گئی ہے اور خود اُس کی ماں نے ہی یہ پاپ کیا ہے..... ٹوٹے ہوئے تارے کی تشبیہ دے کر آپ نے گیت کا سارا درد ہمارے سر پر ورکھ دیا ہے..... اور گیت میں دُھن کو آم کے پیر سے تشبیہ دے کر عورتوں نے اپنی وطنی شاعری کی گہرائی کا ثبوت دیا ہے.....

”ہاں تو اب اپنا وعدہ یاد کیجئے..... کچھ سنائیے۔“

ترویدی نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ وہ نوجوان بولا: آپ خود سنائیں۔
یا ان سے سنوائیں۔ کوئی بھی صورت ہو۔ شغل ہو جائے ذرا۔

میں نے کہا ”خاطر جمع رکھئے۔ میں ضرور سُناؤں گا.....“ ہاں ”تو محل میں

لے دھمک کی ساز جو مارتے پر بندی لگانے کے کام آتی ہے۔

دیا آج بھی جل رہا ہے۔ یہ دیا کبھی بجھنے کا نہیں۔ آج بھی وہ سپاہی جس کی سُر
بیوی کو اُس کی اپنی ماں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، اس دیے کی مدھم چوٹ
میں بیوی کی کوری ساڑھی اور ٹیلڑی دیکھ رہا ہے۔ اُس کی ہتھیلی ماں، باپ
کی سزا سے ڈری ہوئی، نزدیک آرہی اپنی موت کو کنکھیوں سے دیکھ رہی ہے!
پت جھڑکی جھلسی ہوئی پتی کی سی وہ عورت معافی کس منہ سے مانگے،

وہ نوجوان بولا ”آج کا شاعر نہ جانے اس کہانی کو کس طرح بیان کرتا مگر
میں تو سمجھتا ہوں کہ کوری ساڑھی اور ٹیلڑی میں سپاہی کی مرحوم بیوی کے
سارے جذبات پوشیدہ ہیں۔ وجوہ کا لمبا عرصہ اُس نے بنا سنگار کے گزار دیا“
زویدی بول اُٹھا ”اب یہ تقریر بازی چھوڑیئے“

”ہاں تو اب گیت شروع کیجئے“
”کیسا گیت؟“

”ایسا ہی کوئی غمناک گیت سنائیے“
”اچھا تو سنئے۔ ایسی ہی ایک کہانی راجپوتانہ کے گیت میں موجود ہے :
”مائے اکللی رے کالائن اومڑی

مائے اکللی سا برے میہ

پیپو بولیو ہر پالے کھیت میں!“

”ماں اکللی گھٹا اُمد آئی ہے، ماں! مٹو سلا دھار بارش ہو رہی ہے۔

ہریا لے کھیت میں پیپیا بول اٹھا؛

”مائے بھرے ناڑا بھرناڑیا

مائے بھر یورے کھیم تلاو

پپیو بولیو ہریا لے کھیت میں۔“

— ’ماں! چھوٹے بڑے تالاب بھر گئے۔ ماں! کھیم تالاب بھی بھر گیا۔ ہریا

کھیت میں پیپیا بول اٹھا۔“

”مائے! مجھے ہی نے بدھاواں چاکری

مائے! گھری توئے بھل وان

پپیو بولیو ہریا لے کھیت میں۔“

— ’ماں! میں تو نوکری پر چلا ہوں۔ ماں! گھر متارے سپرد رہے گا۔ ہریا

کھیت میں پیپیا بول اٹھا۔“

”بیٹا! کتارے ورساں ری چاکری؟

بیٹا! کتارے ورساں روکول؟

پپیو بولیو ہریا لے کھیت میں۔“

— ’بیٹا! کتنے سال کے لئے (جاؤ گے) نوکری پر؟ بیٹا! کتنے سال کا تول

کرد گے؟ ہریا لے کھیت میں پیپیا بول اٹھا۔“

”مائے! بار بارے ورساں ری چاکری

”مائے! تیرا رے درساں رو کول

پہنچو بولیو کھا بڑے کھیت میں۔“

— ”ماں! بارہ سال ڈکری (رہے گی)۔ ماں! تیرہ سال (بعد آنے کا قول

دکرتا ہوں)۔ ہریا لے کھیت میں، پیپیا بول اٹھا۔

..

..

..

”مائے! کھٹ رے کائے گھر آویا

مائے! کتھی اے سیناں ری دھیب

پہنچو بولیو ہریا لے کھیت میں۔“

— ”ماں! پیسہ کا کر میں گھر واپس آیا ہوں۔ ماں کہاں ہے وہ ساس

سسر کی بیٹی؟ ہریا لے کھیت میں، پیپیا بول اٹھا۔

”بیٹا! ایندھن پانی بہو گئی۔

بیٹا! چھوٹو دیو ریو ساتھ

پہنچو بولیو ہریا لے کھیت میں۔“

— ”بیٹا! بہو ایندھن اور پانی لانے گئی ہے۔ بیٹا! چھوٹا دیو راس کے

ساتھ ہے۔ ہریا لے کھیت میں، پیپیا بول اٹھا۔

”مائے! جل قفل سب میں ڈھونڈیا

مائے! نہیں رے سیناں ری دھیب

پپیو بولیو ہریا لے کھیت میں؟

— ماں! جل تھل تو میں رب ڈھونڈ آیا۔ ماں! کہیں نہ ملی ساس سُسر

کی بیٹی۔ ہریا لے کھیت میں پیپیا بول اٹھا!

”بیٹا! گھٹی رے پسین ہو گئی

بیٹا! چھوٹوڑی نندل ساتھ

پپیو بولیو ہریا لے کھیت میں؟

— بیٹا! پتی پر اٹا پیسنے گئی ہے ہو۔ بیٹا! چھوٹی نند اُس کے ساتھ

ہے۔ ہریا لے کھیت میں پیپیا بول اٹھا!

”مائے! گھر گھر گھٹی میں جوئی

مائے! نہیں رے سیناں ری دھیب

پپیو بولیو ہریا لے کھیت میں؟

— ماں! گھر گھر چکی دیکھ آیا۔ ماں! کہیں نہ ملی ساس سُسر کی بیٹی۔

ہریا لے کھیت میں پیپیا بول اٹھا!

”ترویدی نے کہا ”ان دونوں گیتوں میں تو گجرات اور راجپوتانہ بنگلہ

ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔“

بے شک

”راجپوتانہ کا گیت اتنا آگے نہیں بڑھا جتنا کہ گجرات کا گیت“

”ٹھیک ہے۔ مگر اس میں سپاہی کے نوکری پر جانے سے پہلے کا منظر بھی تو آگیا ہے نا“

وہ نوجوان کہنے لگا۔ ”اب اتنی سی بات پر بحث فضول ہے۔۔۔ دونوں گیت ایک ہی کہانی کو چھو رہے ہیں، یہ تو ظاہر ہے“

میں نے کہا ”سنئے ایک گیت اور سنا تا ہوں۔ یہ صلح انبالہ کا ہے“

’اور دونوں تو کھٹی سی ٹکیا

آج کیوں دی اس اس کھیر کی بتالی ری؟‘

’پہلے تو بہو تیری کٹی اکیلے

آج گھر آئے تیرا باپم ری‘

’اور دونوں تو کھٹی سی لٹی

آج کیوں دیا دودھ کٹورا ری؟‘

’پہلے تو بہو تھی میری ایانی

آج ہوئی تو کسی جوگی ری‘

’اور دونوں تو ٹوٹی سی کھنیا

آج دیا اس اس لال پنگ ری‘

..

..

..

لے آئے گا۔ سہ خاوند۔ سہ کسین۔ سہ لائق۔

’اماں بھی دیکھی، بہنیں بھی دیکھیں
ایک نہ دیکھی میں نے سجنوں کی دھی ری۔
”اُدھی اٹاری، لال کواڑی
وہاں چڑھ سوئی سجنوں کی دھی ری۔“

”میں نے پکارا، بانٹھ بھی ہلائی۔“

پھر بھی نہ بولی سجنوں کی دھی ری؛
عورتوں کا یہ یقین ہے کہ سپاہی کی ماں سو تیلی تھی۔ دھوگ کے دنوں میں
اُس کی بیوی نے بڑی بیٹا کی زندگی گزار لی۔ جس روز سپاہی کے واپس آنے
کی خبر ملی، اس نے اپنی بہو کے لئے کھیر پکائی اور اُس میں زہر ملا کر یہ کھیر
اُسے کھلا دی۔ لال پننگ پر اُس کی سیج لگائی گئی، جہاں وہ ہمیشہ کے لئے
سو گئی۔ سپاہی نے گھر آ کر اُس کی لاش دیکھی، تو کون جانے اُس کے دل
پر کیا بیٹی ہوگی۔“

وہ نوجوان بولا۔ ”میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ کس طرح ایک ہی
کہانی ہندوستان کے تین الگ الگ زبانیں بولنے والے لوگوں کے گیتوں
میں سما گئی ہے۔“

لے بیٹی تھ دروازہ تھ ساس سُسری تھ بازو

میں نے کہا "سدا ہندوستان ایک ملک ہے۔ ایک ہی تمدن ہے جو الگ
 الگ حصوں میں اوپر سے جدا جدا رنگ اختیار کر گیا۔ ہے۔"
 ترمیدی بولا۔ "میری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ یہ گیت ہندوستان کے
 مختلف صوبوں کی بچکانگی پر نہیں بلکہ انسانی جذبات کی بچکانگی پر روشنی ڈالتے
 ہیں۔ گو میں نے دنیا کا سفر بھی نہیں کیا مگر میرا دل کہتا ہے کہ یہ غناک کہانی
 دوسرے ملکوں کے گیتوں میں بھی مل جائے گی۔۔۔ اگر میرے پاؤں کے
 چکر نے سچ بچ زور مارا تو میں پہلے بھٹو آنا پہنچوں گا اور وہاں کوئی ایسا گیت
 ڈھونڈوں گا۔"

بہرنی

”ارے اوڑکاری! چھاتیوں کے علاوہ میرے سارے جسم سے مانس لے کر مجھے چھو ڈے۔ اتنا رحم کر۔ میرا بیٹا، جو ابھی گھاس نہیں کھاتا، میری راہ دیکھ رہا ہوگا!“۔ یوں ایک منسکت شاعر نے جس کا نام تاریخ کو یاد نہیں کسی شکاری کے جال میں پھنسی ہوئی ایک بہرنی کی درد انگیز پکار اپنے ایک شلوک میں قلم بند کر دی تھی۔

مجھے یہ کہنے کی جرات ہوتی ہے کہ یہ مگم نام شاعر جس نے بظاہر ہواں کے بنیادی پیار کا نمونہ پیش کیا تھا، اپنے وقت کے سماجی نظام سے غیر مطمئن ہو چکا

تھا۔ یہ ہر فی کون تھی؛ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر فی کے روپ میں اُس نے اپنے وقت کی غریب مخلوق کو پیش کیا تھا۔ مجھ کے بیٹے کا واسطہ دے کر ہر فی نے شکاری کے دل میں رحم کے جذبے کو ابھارنا چاہا تھا۔ یقیناً شکاری نے اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا ہوگا جو بے درد سرمایہ دار اکثر صدیوں سے روا رکھتا آیا ہے۔

خاص کر اُس زمانے میں جب کہ ادب زندگی کی حقیقتوں سے پرے جا رہا تھا، جب کہ ادیب عوام کے بیچ میں نہیں بلکہ اُن سے الگ ٹھنڈک کسی سردار یا راجہ کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتا تھا، جبکہ عوام کی مجھوک بڑھتی ہوئی غریبی اور صدیوں کی غلامی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ اپنے سرپرست کی طبیعت بہلانے تک ہی اپنی تحریر کا حلقہ سمجھتا تھا، ہر فی کی یہ پچا سنی اُن سنی کر دی گئی ہوگی۔

شاعری کی زبان جذباتی فضا میں جنم لیتی ہے۔ لفظوں میں ایک قسم کا ناچ سا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کسی لفظ کا ذاتی مطلب دب جائے اور وہ شاعر کے وجدانی ماحول میں ایک نیا ہی مطلب پالے۔ اس گم نام سنسکرت شاعر کا یہ شلوک سادگی اور خلوص کا ترجمان ہے۔

۱۷ "اے مانسکھلم ستن درجنگات
ماں مچ داگورک یاہی کرو پرساوم
اڈیالی مھاس کول ٹرسنان پھنگیو
من مارگ دی کشن پرستینو مدی آ!"

اور اس سادہ لباس میں اُس نے اپنے جذبہ کی حرکت ابے چینی اور کسک ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دی ہے۔

ہمارے دیہاتی گیتوں میں ہرنی کی پکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گاؤں کو ایسی بستی مت سمجھئے جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح ملتی جلتی زندگی کے دن کاٹ کر چلتے بٹتے ہیں مصیبت میں سارا گاؤں بل کر روتا ہے، بل کر روٹ بدلتا ہے، روہ چاہتا ہے کہ بھوک اور غریبی ہٹ جائیں اور گم ہوئی آزادی پھر نصیب ہو جائے۔ ان پر تحریک محلوں میں ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف قسمت پر شکا کر رہنے کا مسئلہ پھیکا پڑنے لگتا ہے اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں سدا یوں ہی بنی رہیں گی، سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

پہلے ایک بنگالی گیت سنئے:

”ہرنی گھاس کھائے

شکاری تا مشیائے

آچھی تے ماری دوشیلیر گھا

تکھن ہرنی بلے رے۔

کی شیل ماری لی بھائی تیرنداز رے!

”ہرنی گھاس چر رہی ہے۔ شکاری نشانہ باندھ رہا ہے۔ اچانک

(اس نے) تیکھے تیرے رہرنی کو گھائل کر دیا۔ تب ہرنی کہتی ہے — کیسے
تیکھے تیرے گھائل کر دیا ہے تو نے، 'اوبھائی تیر انداز!'
"نبیر ہرنی آمی

کارو دھار ناہیں دھاری
رکت مانش آمار جگتیر دیری رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"
"میں جھل کی ہرنی ہوں۔ کسی سے کچھ اُدھار نہیں لیتی۔ میرا لہو اور مانس
دُنیا کا دشمن (رہ گیا) ہے رے۔ کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا ہے تو نے،
اوبھائی تیر انداز!"

"تو ر جلار جل نہ کھائی
تو رہیر گھاس نہ کھائی
بنا دو شے بدھیلی آمار پران رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"
— "تیرے تالاب کا پانی پیا ہے نہ تیرے کھیت میں گھاس چرنے گئی
ہوں۔ بغیر قصور ہی میری جان لے لی ہے رے! کیسے تیکھے تیرے گھائل کر
دیا ہے تو نے، اوبھائی تیر انداز!"
"نکھاؤ آئی لام چھاؤ آ لے دودھ

نہ دیکھی لام تار چندر نوکھ
نہ کمی لام سینہہ رسیر کتھارے

کی شیل ماری لی بھائی تیر اندازے!

نہ (جی بھر کر) دودھ پلایا اپنے بچے کو۔ نہ (جی بھر) دیکھ پائی اُس کا چاند
سا کھڑا۔ نہ (جی بھر) اُس سے پیار کی باتیں کر پائی۔ کیسے تیکھے تیرے گھائل کر
دیا ہے تو نے، او بھائی تیر انداز!

"مری تاتے دُکھ نائیں

کنتھو رے تھکاری بھائی

اُوپر دیوتا رکا چھ کی دُبلے جواب رے؛

کی شیل ماری لی بھائی تیر اندازے!"

— "میں مر رہی ہوں" اس کا مجھے دُکھ نہیں۔ پر او تھکاری بھائی! اوپر
دیوتاؤں کے نو بُر دُکھا جواب دے گا، کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا ہے تو نے،
او بھائی تیر انداز!

"جکھن بشتو مہ کھدائے بھلے

کاندی بے ماں ماں بے۔

تار واک دیوتا ربو کے نشچہ باجی بے رے

کی شیل ماری لی بھائی تیر اندازے!"

— جب میرا بچہ بھوک سے زڑپ اٹھے گا! ماں! ماں! کدہ کر روئے گا! اس
کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں گونج اٹھے گی۔ کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا ہے
تُو نے! او بھائی تیرا انداز!

”شنگیر شنگی را بھائی!

کوئی او ہرینار مٹائیں

دودھیر ششور اکھی تے جتنے رے!

کی شیل ماری لی بھائی تیرا انداز رے!

— او میرے ساتھیو اور بھائیو! (میرے) ہرن سے کہنا کہ دودھ
پیتے بچے کو جتن سے پالے پوسے۔ کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا ہے تُو نے!
او بھائی تیرا انداز!

”جنمیر متو دیکھا شنا

بلو تارے آکر ہے نہ

پھرائی لوکل سا دھنکار پر بانے رے

کی شیل ماری لی بھائی تیرا انداز رے!

— جنم بھورشن اور بات چیت اب پھر نہ ہوگی! اُسے بتا دینا (لو اب)
خاتمہ ہو! اسب اُنگوں کا رے! کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا ہے تُو نے
او بھائی تیرا انداز!

”کون نا کا مارے رے
اے شیل گڑی لورے؟
تارنیش ہوک زرنش رے

کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!“

سے کس لوہار نے بنایا تھا یہ تیر؟ اُس کا خاندان بغیر اولاد کے ہی
مٹ جائے۔ کیسے تیکھے تیر سے تُو نے مجھے گھائل کر دیا ہے اوبھائی تیر انداز!
مجھے یہ گیت بہت پسند ہے۔ کسانوں کی زندہ اور روشن شاعری کا، جو
ہندوستان کے ہر صوبے میں صدیوں سے گونج رہی ہے۔ یہ ایک اچھوتا نمونہ
ہے۔ ہرنی کے بول بہت چمچے ٹٹے ہیں۔ شکاری، جو اُسے گھائل کر دیتا ہے،
کچھ جواب نہیں دیتا۔ ہرنی اُسے طنزاً اوبھائی تیر انداز کہہ کر شرمندہ کرتی چلی
گئی ہے۔ ہرنی کی زبان نہیں بولتی، دل بولتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقت
یہ بھی ہے کہ تیر بنانے والا لوہار کچھ کم ظلم نہیں کرتا۔ گیت کے آخری بند میں
ہرنی اپنا سارا غصہ اُسی پر نکالتی ہے۔

ٹھیک بات تو یہ ہے کہ ہرنی کی پکار میں عوام کی آپ بیتی گونج اٹھی ہے

۱۹۵۰ء میں درگاداس لاہوری نے ”بانگاہیرگان“ (ہنگالی کے گیت) نام کا ایک مجموعہ شائع کیا
تھا۔ اس کتاب کا ایک باب ہے ”بزرگ شکر کو رگان“ (دائیں طرف شاعر کے گیت)۔ اُسی میں اس گیت کو عبکہ
دی گئی تھی۔ یہ گیت ترپورے سے ملا تھا۔

مجھے یاد ہے ایک کسان نے کہا تھا۔ ”میری پیتا گھائیل ہرنی کی پیتا ہے اُرد
جب تک ہم کسانوں کا مانس ہرنی کے مانس کی طرح لذیذ رہے گا زمیندار
بالو ہم پر تیر چلانے سے باز نہیں آئے گا۔“

دوسرا گیت ”اُراؤں“ لوگوں کا ہے جو چھوٹا ناگپور میں آباد ہیں :

۱ ”ایکا ترقی ہرنی برچا؛

ٹاٹھا مٹولی نول راہچا۔“

”پوُرب ترقی ہرنی برچا

ٹاٹھا مٹولی نول راہچا۔“

۲ ”ایکا ترقی سکاریس برچس؛

ہرنین تیرتی کوچس۔“

”پچھم ترقی سکاریس برچس

ہرنین تیرتی کوچس۔“

۳ سکاریس گا کوچس

ہرنی ہی پونچھیں کوچس

ہرنی گا بونگا کیرا

ہائے ادین ایوند اڈو منجا۔“

”راہ کس طرف سے ہرنی آئی؟ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔“

پورب کی طرف سے ہرنی آئی۔ وہ آسم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ (۲) کس طرف سے شکاری آیا؟ اُس نے ہرنی کے تیر مارا۔ پتھم کی طرف سے شکاری آیا۔ اُس نے ہرنی کے تیر مارا۔ (۳) شکاری نے ہرنی کی دم پر تیر مارا ہرنی بھاگ گئی۔ ہائے! اُسے کتنا دکھ ہوا۔

یہ گیت "کرا" ناچ کا ہے۔ ہر ایک بند کی دوسری اور چوتھی سطر دوباگائی جاتی ہے۔ انتہا درجہ کی غوشی میں اُراؤں لڑکے اور لڑکیاں اپنے قومی ناچ میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اُن کے سب کے سب کرا گیت غوشی کے ترجمان ہوں۔ کتنے ہی گیتوں میں جیسا کہ اس گیت میں بھی وہ اپنی مصیبتوں کے سیدھے سادے مگر تاثیر میں ڈوبے ہوئے جذبات بیان کرتے ہیں جن پر اُن کے اپنے لہو کے فارغ دیکھے جاسکتے ہیں۔

تیسرا گیت راجپوتانے سے ملا ہے :

”مرگے بنا مرگی ایلڈی !

مرگو چھوڑ گئیو بن کھنڈا میں مرگی نے ایلڈی !

مرگے نے ڈھونڈن مرگی نیسری

ڈھونڈیو ڈھونڈیو بن کھنڈ چھان

مرگے بنا مرگی ایلڈی

مرگو چھوڑ گئیو بن کھنڈا میں مرگی نے ایلڈی !

— ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو تنہا چھوڑ گیا۔ ہرنی ہرن کی تلاش میں نکلی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سارا جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔
”کنھیا نہ لا دھیر جلی مرگہ“

ڈھونڈیا ڈھونڈیا ران کھان

مرگے بناں مرگی ایکڑی

مرگہ چھوڑ گئی بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکڑی۔

— کہیں نہ بلاوہ ظالم ہرن۔ بار بار اُس نے وہ جنگل بیاوان چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

”ڈھونڈت ڈھونڈت مرگی تنک گئی“

ب کے آنکھیاں آنسو جان

مرگے بناں مرگی ایکڑی

مرگہ چھوڑ گئی بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکڑی۔

— ڈھونڈتی ڈھونڈتی ہرنی تنک گئی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے

ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

”کھانے ترواں مرگی ڈھے پڑی“

کوئی یو دکھ سہیو نہ جانے

مر گئے بنا مرگی ایکلوی

مرگو چھوڑ گینوں کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلوی

چکر کھا کر ہرنی گر پڑی۔ یہ دکھ سہا نہیں جاتا۔ ہرن کے بغیر

ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

کون جانے ہرن کہاں چلا گیا تھا؛ منورائے کسی شکاری نے مار

ڈالا ہوگا۔ شروع سے اخیر تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہرنی دراصل کوئی
گاؤں کی عورت ہے۔

چوتھا گیت پنجاب کا ہے :

”نہ مائیں میرے ہرن نڈں ساڈی سستی ہوجاؤ ڈار

ماروے راجیا ہرنیاں بھائیں اکت دو بھائیں چار“

— میرے ہرن کو نہ مارنا۔ ہماری قطار سونی ہو جائے گی۔ راجہ !

ہم ہرنیوں کو مار لے، ایک دو چاہے چار

یہ گیت نامکمل ہے۔ یہ ہرنیاں راجپوتانہ کی ”ہرنی“ کی بہنیں ہی تو ہیں۔

یہ گیت مصیبت زدہ لوگوں کے آئینوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں ایک

اپنا ہی سوز ہے جو دل سے نکلتا ہے اور ساری فضا میں سما جاتا ہے۔

پانچواں گیت ”بندھیل کھنڈ (وسط ہند) کا ہے :

”موئے مار لے جاؤ ہمارے ہرنے جن مارو!
 جریں پیاکے کھیت ہمارے ہرنے جن مارو!
 کون دسن کے ہو گئے رکاری، کون دسن کے ہو گئے ہیلیا؟
 کون دسن کو جاؤ ہمارے ہرنے جن مارو!
 اگم دسا کے نہیں گئے رکاری پچم دسا کے ہیں گئے ہیلیا،
 پورب دسا کو جائیں ہمارے ہرنے جن مارو!
 کائے کی کھٹیاں کلے کی تاتیں؛
 کائے کی ڈوری لگاؤ ہمارے ہرنے جن مارو!
 لوئے کی کھٹیاں تانت کی تانتیں

رٹیم کی ڈوری لگائیں ہمارے ہرنے جن مارو!“

”مجھے مار لے جاؤ۔ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ ہم تو اپنے پیاکے کھیت
 میں چرتے ہیں، ہمارے ہرن کو مت مارو۔ کس سمت کے شکاری ہو؟ کس
 سمت کے ہیلیا ہو؟ کس سمت کو جا رہے ہو؟ ہمارے ہرن کو مت مارو۔
 آگے کی سمت کے شکاری ہو۔ پچم کے ہیلیا ہو۔ پورب کی طرف جا رہے ہو۔
 ہمارے ہرن کو مت مارو۔ کس چیز کی کھونٹیاں ہیں؟ کس چیز کی تانتیں ہیں؟
 ہمارے ہرن کو مت مارو۔ لوہے کی کھونٹیاں ہیں۔ تانت کی تانتیں ہیں۔

ہمارے ہرن کو مت مارو
چھٹا گیت بھی بندھی لکھنڈ کا ہے :

”ارے پاہروی ! مان لے میری بات

پاہروی ! مان لے میری بات

جب ہیں پاہروی پھانسی روپی

چونسٹھ کھنٹیاں گاڑیں

ہرنی کو ڈنبل بھٹی ٹھاڑی

ہرن کو بیدھو پاؤں

رام جی ! ہرن کو بیدھو پاؤں !“

”ارے شکاری ! میری بات مان لے۔ شکاری ! میری بات مان لے !

جب شکاری نے پھندا لگایا (اُس نے) چونسٹھ کھنٹیاں گاڑیں۔ ہے

رام ! چونسٹھ کھنٹیاں گاڑیں۔ ہرنی کو ڈنبل میں جا کھڑی ہوئی۔ ہرن کا پاؤں

پھنس گیا ہے رام ! ہرن کا پاؤں پھنس گیا۔

”ٹھاڑی ہرنیا جو سمجھائی۔“

سنو پاہردی بات

موئے مار میرو پیا کے چھوڑ دے

ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ

پاہردی! جوئیں نہ چونسٹھ رانڈ!

— ہرنی کھڑی ہوئی یہ سمجھا رہی ہے — اونٹکاری! میری بات سن۔
مجھے مار ڈال۔ میرے پیالے کو چھوڑ دے تاکہ ہم چونسٹھ رہبریاں رانڈ ہونے
سے بچ جائیں، اونٹکاری! چونسٹھ رہبریاں رانڈ ہونے سے بچ جائیں؛
”ٹھاڑی ہرنیا آٹو ڈھارے —

سن ہرنا موری بات

تم تو بید ہے جاچند امیں

میرو کون حوال؟

ہرنا! میرو کون حوال؟

— ہرنی کھڑی ہوئی آٹو گرا رہی ہے — اوہرن! میری بات سن
تو تو اس پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہوگا، اوہرن! میرا کیا حال ہوگا؛
”ٹھاڑی ہرنا جو سمجھا ریا

سنو ہرنیا بات —

باکے گھر کو خرچ بڑھانو

بیچ کھان دے ماس

ہرنا! بیچ کھان دے ماس!

— ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے — ہرنی! میری بات سن۔ اس کے

گھر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ اُسے میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے ہرنی! اُسے
میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے!

”اتنی سُن کے پلے پاہردی

پھانسی ڈاری کاٹ

مٹاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے—

جوڑی ہلائی بھگوان

پاہردی! جوڑی ہلائی بھگوان!

— اتنی بات سُن کر شکاری آگے بڑھا۔ اُس نے پھندا اکاٹ ڈالا۔

ہرنی آنسو گرا رہی ہے۔ (رکتی ہے) بھگوان نے (پھر سے) جوڑی ہلا دی
شکاری! پھر سے جوڑی ہلا دی!

یہ وہ گیت ہیں جن میں عہدِ ماضی کی تصویریں محفوظ ہیں۔ ماضی بھی
ایک آئینہ ہے۔ جس میں ہم انسانی سیرت کی ارتقائی حالتوں کا جائزہ
لے سکتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا کہ ہم اب تک کہاں پہنچے
ہیں ممکن نہیں۔

جنہوں نے بدھ مت کی جانب سے کہا نیول کا مطالعہ کیا ہے انہیں سون گاتھا

۱ دیکھئے *suvarnamigga gataka* جو کہ کیمبرج یونیورسٹی پریس کی شائع کردہ *The*
gataka کتاب ۵ نمبر ۲۹۵ میں ہے گی۔ پروفیسر *Cowell* نے یہ کہانیاں بھی
عنّت سے رقب کی ہیں۔

کی یاد آگئی ہوگی۔ کہانی بتلاتی ہے کہ کسی پچھلے جنم میں مہاتما بھٹنرے ہرن کے روپ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک دن کسی شکاری نے جال لگایا باقی سب ہرنیاں اور ہرن بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر ٹولی کا سردار یعنی وہ سنہرا ہرن خود جال میں پھنس گیا۔ وہ چلا یا تو اس کی رفیقہ حیات بڑی ہوئی آئی۔ بولی: "تمہارے بغیر اب میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی؟" ہرن بولا: "میں بہت زور لگا چکا کہ پھندے سے چھوٹ جاؤں مگر نات میرے پاؤں میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔" ہرنی کہنے لگی: "فکرمست کرو۔ میں تمہیں بچاؤں گی۔" پھر جب شکاری نزدیک آتا دکھائی دیا وہ بولی: "شکاری مجھے تم خوشی سے مار ڈالو۔ پر میرے سنہرے ہرن کو چھوڑ دو۔" یاد دہانی پر پتوں کا بستر بچھا دو، جس پر ہم گر پڑیں۔ پھر میان سے تلوار نکال کر پہلے میری گردن کاٹ لو، پھر میرے خاوند کی! "شکاری چتر میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا۔ آدمی بھی یوں اپنے آقا کے لئے جان دینے سے کترا جاتا ہے۔۔۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ ہرنی انسان کی زبان بول رہی ہے۔ شکاری نے ہرن کو آزاد کر دیا۔ ہرن نے خوش ہو کر اُسے ایک لعل دیا جو اُسے کسی چراگاہ میں پڑا ہوا بلا تھا اور جسے اُس نے اپنے گھر میں پھنسا رکھا تھا۔ اُس نے شکاری کو یہ تلقین کی کہ وہ اس سے اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرے اور شکار کا پیشہ چھوڑ دے۔

”ممکن ہے“ جاتک کہانی کی پیروی میں ہی مہذیل کھنڈ کے کسانوں نے اپنے ان دونوں گیتوں کی تخلیق کی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود جاتک کہانی نے دیہاتی گیتوں کی پیروی کی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ مہذیل کھنڈ کی گیتوں کی زبان بہت پُرانی نہ ہوگی۔ مگر گیتوں کے جذبات اُن کی زبان سے کہیں زیادہ پُرانے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وقت کے ساتھ پُرانے گیتوں کی زبان بدلتی رہتی ہے۔ جاتک کہانیوں کے متعلق بعض علم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ وہ شروع میں عام دیہاتی کہانیاں تھیں اور گیتوں کے چھوٹے چھوٹے نمونے جو ان کہانیوں میں پروئے ہوئے ہیں دیہاتی گیتوں سے لئے گئے تھے۔

ساتواں گیت کوندھ لوگوں کا ہے جو کہ گنور اودے گری (مدراس پریزیڈنسی) میں آباد ہیں :

”ایڑا اینوں گوڑی ویدی گنا، اوپلامبا گتاتی !

اوپلامبا گتاتی، اوپلامبا گتاتی !

آنو گوسا تاگی ڈیگنا نائیں، اوپلامبا گتاتی !

کاڑیگی سولاتی اسی، اوپلامبا گتاتی !

ایڑا اینوں گوڑی ویدی گنا، اوپلامبا گتاتی !

— شکاری ! تم مجھ پر تیر چلاؤ گے، شکاری، او شکاری ! جنگل میں

دوڑتی ہوئی، شکاری، میں گھاس چروں گی، ارے اوشکاری، شکاری، مکیا
تم مجھ پر تیر چلاؤ گے؟

”آؤں نا میں میڈا آہا نا میں اسی نے اُونے ترے اسی ماں!

ایڑا اینڈ گورڈی وی وی گنا اوپلا مبالغہاتی!

آؤں نا اوتا تانی کوری، اوپلا مبالغہاتی؟

ایڑوں ناں گی تہجادی گنا اوپلا مبالغہاتی!“

— اپنے بچے کو ساتھ لئے ادھر ادھر گھوموں گی۔ شکاری، اؤ مجھ پر

تیر چلانے گا؟ مجھ ہرنی پر تیر چلانے گا، ارے اوشکاری، مجھے تیر سے

مار ڈالے گا، اوشکاری، میں دھرتی پر سو جاؤں گی، اوشکاری، مجھے کھا

جائے گا کیا، ارے اوشکاری؟“

جذبات و احساسات کی کہانی، جو لوگوں کے نسل در نسل چلے آنے

والے گیتوں میں پائی جاتی ہے، سطحی امتیاز سے بہت کم متاثر ہوتی ہے

زبانیں الگ الگ ہیں۔ بات کہنے کا ڈھنگ بھی مختلف ہے۔ مگر الگ الگ

علاقوں کی ذہنی یگانگی صاف ظاہر ہے۔ مصیبت کی ماری کو نڈھ عورت بھی

خود کو اُس ہرنی سے تشبیہ دیتی ہے جو بلا تصور ہی شکاری کے تیر سے

گھائل ہو کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہے، اور اس کے بعد شکاری اُس کے

جسم کا مانس خود کھائے یا کسی کو کھلائے اس سے ہرنی کی موت میں

کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہاں موت سے پہلے ہرنی کے دل میں یوں سوالات کا اٹھنا اس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔

آٹھواں گیت یوپی کے دیہات میں گایا جاتا ہے:

۱ چھاپک پیڑ چھی اُلیا

تو پت و ن گہر بر

ارے راماتہی ترٹھاڑھی ہرنیاں

ت من اتی ان منی ہوا

۲ چرتے چرت ہرنواں

تو ہرنی سے پوچھی ہو

”ہرنی کی تو رچ رہا جھڑان

کی پانی بن مڑھی او ہو“

۳ نہ ہیں مورچ رہا جھڑان

نہ پانی بن مڑھی اول ہو

ہرینا! آج راجاجی کے چھٹی

تو ہیں ماری ڈرہیں ہوا“

۴ مچھے بیٹھی کوشیدیا رانی

ہرنی ارج کرنی ہو—

”رانی! مسودا تو سمجھ ہیں رسوئیاں

کھلایا ہمیں دیتی اُو!“

۵ پیڑوا سے ٹنگ بنی کھلایا

ت من سمجھا اُب ہو

رانی! ہیری پھیری دیکھ بنی کھلایا

جنگ ہرنیا جیتی ہو!“

۶ ”جا ہو ہرنی گھراپنے

کھلایا ناہیں دیہی ہو

ہرنی! کھڑی ک کھنڈی مرد ہو بنی

ت راما مور کھیلی نہیں ہو!“

۷ ”جب جب باجی کھنڈیا

سب سنی ان کئی ہو

ہرنی مٹاڑھی ڈھنکویا کے نیچے

ہرن ک بسورنی ہو!“

— (۱) ”ڈھاک کا چھوٹا سا پیڑ ہے ایک۔ گھنے پتوں سے لہلاتا ہوا۔

اُس کے نیچے ایک ہرنی کھڑی ہے۔ ہے رام! اُس کا من بہت اُداس ہے۔

(۲) چرتے چرتے ہرن نے پوچھا! ہرنی! چراگا، سوکھ گئی ہے کیا! یا پانی

کے بغیر مڑ جھا گیا ہے (تیرا من) ۹

(۳) نہ میری چراگاہ ٹوٹھی ہے، نہ پانی کے بغیر مڑ جھایا ہے (میرا من)۔
ہرن! آج راجہ کے (نٹھے کی) چھٹی ہے۔ آج (راجہ کے شکاری) تجھے مار ڈالیں گے۔

(۴) رانی کو شبیا میٹا پر بیٹھی ہے۔ ہرنی عرض کر رہی ہے۔ رانی (میرے
ہرن کا) مانس تو (تھاری) رسوئی میں پک رہا ہے۔ (ہرن کی) کھال مجھے
دلوادو۔

(۵) 'یہ کھال میں پیڑے ٹانگ دوں گی۔ گھوم پھر کر (اُسے) دیکھا کروں گی۔
رانی! دیکھ دیکھ کر اپنے من کو سمجھائوں گی جیسے ہرن جیتا ہو۔'
(۶) 'ہرنی! اجا اپنے گھر کو چلی جا۔ یہ کھال میں نہ دوں گی۔ اس سے تو
ڈفلی مڑاؤں گی۔ (میرا) رام اس سے کھیل کرے گا۔'

(۷) جب جب ڈفلی جیتی ہے (اُس کی) آواز سن کر ہرنی کان کھڑے
کر لیتی ہے۔ ڈھاک کے نیچے کھڑی ہو کر ہرنی ہرن کی یادیں کھوجاتی ہے۔
یہ چھوٹا سا گیت المیہ شاعری کے کسی بھی شاہکار سے ٹخترے سکتا ہے۔
اُسے 'سوہر' گیتوں کی برادری میں جگہ ملی ہے۔ بیٹے کے جنم کی خوشی میں یکپل
گایا جاتا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت ممکن ہے کہ گلی محلے کی
لے ایک قسم کی پریمی۔

عورتیں خوشی کی مستی میں اس گیت کے غناک منظر کی طرف بہت توجہ نہ دیتی ہوں۔ مگر کوئی کوئی عورت تو ایسی بھی ہوتی ہوگی، جسے ہرنی کی درد انگیز کہانی میں اپنی زندگی کا سارا غم نظر آجاتا ہوگا۔

کوشتیا اور رام کے نام اس گیت میں کیوں پروئے گئے ہیں، اس کی تشریح آسان نہیں۔ تاریخی ناموں کو عام گھریلو زندگی کی دھرتی پر لا بٹھانے کا رجحان بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ دیہات میں گھر گھر اس سر میں کوشتیا اور دشرتھ کا تصور کیا گیا ہے۔ پھر ہر ماں اپنے بچے میں رام کی تصویر دیکھ لے، یہ کوئی اُن ہونی بات نہیں۔ ہر صوبے میں گھریلو زندگی کے گیتوں میں رام سینا اور لکشمی تو کسانوں کی زندگی میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ مگر اس گیت میں بے رحم عورت کے روپ میں کوشتیا کا تصور ایک نامناسب رجحان کا ترجمان ہے۔

پنڈت رام نریش تریپاٹھی نے لکھا ہے۔ ”ہرنی ہرن کی کھال اس لئے مانگتی تھی کہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر دل کو ڈھارس دے گی اور ہرن جیتا ہے، اس دہم کو بچ بچ کر ایک فرضی شکھ محسوس کرے گی۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں جو اپنے مرحوم خاوند یا بیٹے کی چیزیں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہیں اور تنہائی میں انہیں دیکھ دیکھ کر ایک خاص قسم کا شکھ محسوس کیا کرتی ہیں۔ آخر ہرن کی کھال کی خنجر بنی۔ خنجر جب بھتی بھتی، تب اس کی آواز سے

ہرنی کے دل میں محبت کی تاریخ جاگ اٹھتی تھی۔۔۔ گیت کی ہرنی کی خاموش تڑپ انسان کے دل کو بلا دینے والی ہے۔ یہاں ہرنی کے بہانے سے کسی عورت نے اپنی ہی تصویر لا کر کھڑی کر دی ہے۔

نواں گیت بھی یوہ پی کا ہے :

یہ بھی ”سوہرگیت“ ہے۔ پھر ایک بار ہم ایک ہرنی کا من اُداس پاتے ہیں۔ سیتا گرہوتی ہے۔ آج سیتا کے بیٹا ہوگا۔ اس خوشی میں ہرنی کے پیار سے رنیتی حیات کو گلشن ڈھونڈنے آئے گا۔ اور راجہ کا شکاری ہرن کو مار ڈالے گا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہرنی کو شلیبا کے پاس جا کر ہرن کی جان بچشوا لیتی ہے۔ یہاں کو شلیبا کی زبان سے جو لفظ کملوئے گئے ہیں ہمدردی اور خلوص سے لبریز ہیں :

”چھوٹ موٹ پیرا ڈھکیو لیا

ت پتوارے لہالی ہو۔

راما تا تا تر مٹا مٹی ہرینا

ہرن باٹ جو مٹی ہو۔

”چھوٹا موٹا ڈھاک کا ایک پیڑ ہے۔ وہ پتوں سے لہلا رہا ہے۔

۵۰ ”کویتا کو مٹی۔ گرام گیت“ (ہندی)۔ جنت رام نریش ترپاٹھی ہندی کے مشہور ادیب ہیں۔ دیگر ادبی خدمات کے علاوہ ”دیہاتی گیتوں“ کے مطالعہ میں بھی آپ کی کوشش شاندار ہے۔۔

ہے رام! اس کے نیچے ہرنی کھڑی ہے۔ وہ ہرن کی راہ دیکھ رہی ہے۔

”بن میں سے نکلے لاہرینا

ت ہرنی سے پونچھے ہو۔

’ہرنی! کاہے تو رہن ملین

کاہے منہ پی ار ہو؟“

— جگل سے ہرن نکلا۔ اس نے ہرنی سے پوچھا — ہرنی کس لئے تیرا

چہرہ اُداس اور پیلا پو گیا ہے؟

”گئی لوں میں راجہ کے دواریا

ت بتیا سن اتی لوں ہو

پیارے آج چھوٹے راجاک بہیلیا

ہرن مروئی نہیں ہو!“

— راجہ کے دروازے پر گئی تھی۔ وہاں سے بات چیت سن آئی ہوں۔

پیارے! آج چھوٹے راجہ اپنے شکاری سے ہرن کو مروا ڈالیں گے!

”کیہی جے بگیا کولے؟

کیہی رے آئے دھنڈلے ہو؟

ہرنی کے کردھنیا گرجہ سے

ہرن مروا ولے ہو؟“

— 'کس نے باغ لگوایا؟ کون مجھے اڈھونڈنے آیا؟ ہرنی! کس کی جوان
بیوی گریدھرتی ہے کہ ہرن کو مرواڈالیں گے؟
'دشترتھ بگیا لگولیں

لکھن آئے دھونڈ لے ہوا
پیارے رگھو بردھنیا گریدھ سے

ہرن مرواڈ لے ہوا

— 'دشترتھ نے باغ لگوایا۔ لکشمین (تجھے) دھونڈنے آیا۔ پیارے
رام چندر کی جوان بیوی گریدھرتی ہے (اُسی کے لئے) ہرن کو مرواڈالیں گے۔
"کر بوڑی ہرنی عرج کرے —

ہن کوشتیا رانی ہوا

رانی سیتا کے ہوتی ہیں نند لال

ہم ہی کچھ دی ہب ہوا

— 'ہاتھ جوڑ کر ہرنی عرض کر رہی ہے — سنو، کوشلیا رانی! آج رانی سیتا
کے ہاں بیٹا ہوگا۔ مجھے کچھ دو۔

"سولواڑھٹی بوں دھوڑ سگوا

بھوجنا تل چا ا رہو

ہرنی جھگتھو اہودھیا کے راج

ابھے بن بچ رہو ہوا“

سو نے سے مڑھاؤں گی رتیرے ہرن کے (دونوں سینک) کھانے
کو (دوں گی) اقل اور چاول۔ (لودھیا کے راج کا) لکھ بھوک، ہرنی اور بے
ہو کر جنگل میں گھوم پھرنے“

ہرن بچ گیا۔ یہی بس ہے۔ ہرن کے سینک سچ سچ سونے سے مڑھائے
گئے تھے یا نہیں، اس کی ہمیں پروا نہیں۔ ایک گہرا احساس، جو کہ شلیا
کے فطرتوں میں موجود ہے، ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی میں رحم اور
بہمدردی نے اپنی جگہ بالکل ہی گنوا نہیں دی۔ کمینگی اور ٹھنڈی کا گھیرا
تو ہے ہی۔ مگر زندگی کی کچھڑے بھی ایک کنڈل کھل اٹھتا ہے، جس کی
خوشبو سے آدمی کی زندگی میں ایک پاکیزہ احترام، ایک بلند پایہ جذبہ نسیب
ہوتا ہے جس سے متاثر ہو کر ہم تمام جانداروں کے درمیان ایک خاص قسم کی
یگانگی محسوس کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا تقابلی مطالعہ سبب
اہم ہے۔ ان صوبوں میں بھی، جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی
زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، کتنے ہی فارسی
اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ زبان کے
متعلق ہمارا تعصب سرے سے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی لفظ

کا استعمال نہیں کرتے کہ اُس کا حسب نسب، جنم استھان یا مذہب کیا ہے
 بلکہ ہر لفظ اُن کی زبان پر اُسی طرح آتا ہے، جیسے دھرنی پر کوئی پودا اُگتا ہے۔
 تلاش کرنے پر بہرنی کے گیت دوسری زبانوں میں بھی اُبل جائیں گے
 ... ہندوستان کے طول و عرض میں بہرنی کی پکار گونج رہی ہے۔ رگڑ وال
 تریہ ہے کیا ہمارا وطن یوں ہی بنکیں رہے گا؟ کیا ہماری قوم یوں ہی مُسہ
 ! شور مچ رہی ہے گی؟ "شکاری بھائی" کب تک اُس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ کب
 نہ پے گی بہرنی خوشی میں آکر

دیا جلے ساری رات

یوں جُدائی کے گیت میں نے اُکھڑے تھے۔ پنجابی ہی میں نہیں،
 ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی۔ بہتوں کو میں نے بے حد پسند
 کیا تھا۔ پھر میری شادی ہو گئی۔ اور وہ بھی ایک ترکیب سے، تو نہ
 جانے کیوں میرا رُحمان بدل گیا۔ جُدائی کے گیت مجھے بہت زیادہ
 پسند نہ آتے تھے، اُن کی پہلی کشش کہیں کھوئی گئی ہو جیسے۔
 ہاں، وہ ترکیب بھی بتادوں جس سے میری شادی ہو گئی۔ جگہ جگہ کی
 مسافرت کے بعد۔ اڑھائی تین سال گھر سے باہر خانہ بدوشی کی ہنسی منگی
 گزار کر۔ میں گھر پہنچا تھا۔ میں تو اسے مسافرت ہی سمجھتا تھا، یہ دوسری بات

ہے کہ پتا جی اسے نرمی آوردہ گردی کا نام دے رہے تھے۔ شادی کا سوال اس لئے اٹھا کہ میں گھر سے بندھ جاؤں۔ خانہ بدوشی سے منہ موڑ لوں، دل کی ملنا میں اور محبت کی ڈور اپنے گاؤں کے ساتھ باندھ لوں۔ پتا جی کے اس چھپے خیال کو میں نے شروع ہی میں بھانپ لیا تھا۔ میں نے شادی کے لئے ہاں کہہ دی، تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ میں جانتا تھا کہ شادی کے بعد میری ذمہ داری بڑھ جائے گی۔ محبت کستی تھی، ابھی ذمہ داری کی بات نہ تھی۔ طوطا مالی سوال سے جیسے محبت کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ یہی مسافر ہیں میں کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا۔ محبت کے جذبہ نے مجھے خزا کھینچنے کے لئے تیار کر دیا۔

جس لڑکی سے میری شادی ہوئی قرار پائی، اُسے میری ماں دیکھ آئی تھی۔ میں جان لینا چاہتا تھا اس لڑکی کے دل کا حال۔ جب وہ مسکراتی ہے اُس کی آنکھوں میں کون سی کرن دوڑ جاتی ہے، یہ بھی میں جان لینا چاہتا تھا۔ اُسے کس طرح کے خواب آیا کرتے ہیں؟ یہ سوال بار بار اٹھا، مگر بس دل کی گرائیڈوں میں ہی بند رہا۔ ماں سے تو یہ سب باتیں پوچھی نہ جاسکتی تھیں، اور یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ ماں ان سوالات کا جواب دے بھی سکتی ہے یا نہیں۔

ایک فکر ایک دن با دل کی طرح اٹھا اور دھیرے دھیرے دل کے

کونوں تک پھیلنے لگا۔ کیا وہ اجنبی لڑکی یہاں آتے ہی مجھ پر ایسا جادو ڈال
سکے گی کہ میں باہر نہ جاسکوں گا، خانہ بدوشی کو خیر باد کہہ دوں گا؟ پیچھے ہٹنا
بھی تو ممکن نہ تھا۔ آخر میں نے یہ سوچ کر کچھ تسلی پائی کہ شاید وہ بتلی کی طرح
پنکھ پھیلا پھیلا کر میرے ساتھ ساتھ اڑا کرے گی، میرے ساتھ وہ بھی خانہ بدوشی
اختیار کرے گی۔

ہاں، تو جُدائی کے گیت کی بات تو میں بھول ہی رہا ہوں۔ شادی
کے بعد ایک دن میں نے سسرال میں نوجوان لڑکیوں کو ایک گیت
گاتے سنا۔ گیت کی لے میں ایک خاص سوز بھرا تھا۔ ترنم بھی موجود تھا۔
مٹی کے ٹمٹاتے دیئے کی طرح ہی جیسے خود جُدائی ٹمٹارہی تھی، ٹپ
کے گیت پر پہنچتے ہی سب لڑکیاں غیب زور دار ڈھنگ سے آواز بلند کر
گاتی تھیں:

”دیوا بلے ساری رات، میرا ظالما“

دیوا بلے ساری رات

بتیاں بٹا رکھدی، میرا ظالما

”دیوا بلے ساری رات“

آدینگا تاز بچھ لوالگی

میرا ظالما!

کتنے گزاری ساری رات ؛
 بٹیاں بٹا رکھ دی
 میریا ظالما !
 دیوا بلے ساری رات !

”اویگا تاں مجھ لوں گی
 میریا ظالما !
 کتنے گزاری ساری رات !
 دیوا بلے ساری رات
 میریا ظالما !
 دیوا بلے ساری رات !“

— ”دیوا ساری رات جلتا رہتا ہے“ او میرے ظالم !
 دیوا ساری رات جلتا رہتا ہے
 بٹیاں تیار کرو رکھتی ہوں ، او میرے ظالم !
 دیوا ساری رات جلتا رہتا ہے !
 تو آئے گا تو میں پوچھ لوں گی ۔
 او میرے ظالم !

کہاں گزاری ساری رات؟
 بٹیاں تیار کروا رکھتی ہوں
 او میرے ظالم!
 دیا ساری رات جلتا رہتا ہے!

تو آئے گا تو میں سمجھ لوں گی
 او میرے ظالم!
 کہ تو نے کہاں رات گزاری۔
 دیا ساری رات جلتا رہتا ہے
 او میرے ظالم!
 دیا ساری رات جلتا رہتا ہے!

دُور سے میں نے یہ گیت سنا تو سوچا کہ کیا اُدھر توجہ نہ دوں۔ مگر میں
 نہ رہ سکا۔ مجھے نزدیک آتے دیکھ کر لڑکیوں نے گیت بند کر دیا۔ اُن میں
 میری نئی نوپلی بیوی بھی تھی۔ گیت بند کرنے کی صلاح رانو نے دی تھی،
 یہ معلوم ہوتے دیر نہ لگی۔ سبھی ہیلیاں ایک دوسری سے اُلجھنے لگیں۔
 پرستی نے کہا، کیوں ری رانو، اب گاتی کیوں نہیں ری؟ کیا تو چاہتی
 ہے کہ جیسا جی تیری مینٹ کریں؟

پاس سے سوٹیا بول اٹھی، ہاں، ہاں، تو کیا سمجھتی ہے، پرستی؟ ہاں سے گیت کیا مفت میں آتے ہیں؟

میراجی چاہتا تھا گیت شروع ہو سوچتا تھا، دُور سے ہی کیوں نہ منٹنا رہا۔ اب منٹ نہ کرتا، تعریف کے دو لفظ کہہ دیتا تو بھی شاید لوگ یاں اپنا پھر چھپو دیتیں۔ مگر میں اتنی جرات بھی تو نہ کر سکا۔

جلد گیت محفل برخاست ہو گئی، کالی کالی آنکھیں، مڑھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اوجھل ہو گئیں۔ اب نہ رانا تھی، نہ پرستی، جن کی آنکھوں میں ان کے دل دیکھے جاسکتے تھے۔ پرستی سے بھی زیادہ مجھے رانا سے اُلفت تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ گیت گانے میں کوئل تھی، اس سے بھی زیادہ اس لئے کہ وہ بھولی تھی اور آنکھ میں دل رکھ کر مسرانا جانتی تھی، نین بے نیازی کے انداز سے۔ نئے پتے بیر کی طرح اُس میں ایک تازگی تھی، خاص اپنا پن لئے ہوئے۔

یہ گیت میں نے پہلے بھی سنا تھا مگر کبھی مجھ پر اتنا اثر نہ ہوا تھا۔ ایک بار میں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، اب معلوم ہوا کہ اُس وقت مجھ پر اس کی رُوح ظاہر نہ ہوئی تھی۔ گیت کیا ترجمہ کی چیز ہو سکتی ہے؟ اور پھر بہن کے دیے والا یہ گیت۔

رانا نے اُسے کسی اچھوتی طرز میں گایا ہو یہ بات نہیں۔ اُس سے

کہیں اچھا تو میں خود گالیتا ہوں، اور اکثر گایا کرتا ہوں۔ پھر بھی نہ جانے اس روز راتوں اور اس کی ہسیلوں کی زبان سے یہ گیت سن کر مجھ پر اس کا اتنا اثر کیوں ہوا؟

سُسرال سے واپس آ کر جیسے میں اور سب گیت بھول گیا۔ میری پسند کا ایک ہی مضمون تھا اور وہ تھا ”برہن کا دیا اور اس کا گیت۔ جُڑائی کا یہ گیت میری ساری زندگی پر چھا جانے کے لئے تیار دکھائی دیتا تھا۔ اپنی بیوی کو یہ گیت سنانے کے لئے میں بہت کتا، وہ شرماتی، اس کی آنکھیں اُپر نہ اٹھتیں نہ ہاں، نہ نہیں۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کس شرط پر یہ گیت سننے کے لئے تیار ہو سکتی ہے۔ مجھے ہلکا سا عقدہ بھی آ جاتا۔ بنگال، گجرات اور مہاراشٹر میں ایک دم اجنبی لڑکے لڑکیوں سے گیت سن آیا تھا، اور یہاں میں اپنے گھر میں گیت سننے میں ناکام ہو رہا تھا۔

پھر ایک دن مجھے وہ گیت پاس آتا محسوس ہوا۔ ایسے موقع پر میری آنکھیں لہجائی ہیں، چاہتا ہوں، اپنا دل چھاتی سے نکال کر آنکھوں میں رکھ لوں۔ اب چھوڑ دو یہ شرم کی رسم! میں نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجک کر بولی ”میں تو خود چاہتی ہوں کہ نہ شرم لوں“

میں سمجھ گیا کہ اب کامیابی دُور نہیں۔ بولا ”تو پھر مل جائے سننے کو وہی
برہن کے دیے والا گیت۔“ مگر وہ کوئی دوسرا ہی گیت منانے کے لئے تیار
ہوئی تھی۔ تھا وہ بھی برہن کا گیت۔ میں نے کہا ”اچھا وہی سناؤ۔“
گیت شروع کرتے کرتے وہ شرمیلی تھی۔ کافی گہرا گیت تھا۔ پانچ
دریاؤں کے وطن کی — پنجاب کی — کسی سوہنی یا بہیر کا پُرسوز گیت تھا:
”اُدھ گئے سجن اُدھ گئے“

لنگھ گئے دریا

اساں رَج گلاں نہ کیتیاں

سانڈے منوں نہ لٹھڑا چا!

— وہ گیا۔ پر تم وہ گیا۔ وہ دریا کے اُس پار چلا گیا۔ نہ ہم نے جی بھر کر
باتیں کیں، نہ ہمارے دل کا شوق پُورا ہوا!

یہ عورت کا گیت تھا اور عورت ہی ایسا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ یہ وہ بھی
جانتی تھی کہ میں برہن کے دیے والا گیت نہ چھوڑوں گا، نہ اُس کی جگہ
کوئی دوسرا گیت لے سکے گا۔

پھر کئی کئی دن تک میں نے گیتوں کی بات چھیڑنی ہی بند کر دی
گاؤں سے لاہور آ کر بھی میں نے یہی طریقہ جاری رکھا۔ اُمید کستی تھی،
کبھی نہ کبھی میری بیوی ضرور برہن کے دیے والا گیت گانے لگے گی، مگر غلط

کویوں ہی تھک جانا پڑا۔

پھر لاہور سے گاؤں واپس آکر بھی مجھے وہ گیت سننے کو نہ ملا۔ اب مجھے بہت جلد باہر مسافرت پر جانا تھا۔ پتا جی نے لاہور میں چند ماہ گزارنے کی منظورمی بھی بڑی مشکل سے دی تھی، اس لئے میں نے کسی دن چوری سے لمبے سفر پر بھاگ جانے کی ٹھان لی تھی۔ پتا جی نے سوچا تھا کہ لاہور میں چند ماہ بیوی سمیت رہ کر اب میں گھر پر آرام سے رہنے کا فیصلہ کر لوں گا۔ اور پھر دھیرے دھیرے وہ مجھے اپنے ساتھ نہرو پور ٹھیکیداری کا کام سپرد کر دیں گے۔ اُن کو شاید معلوم نہ تھا کہ لاہور میں ان چند ماہ کی رہائش کے دوران میں پیش آنے والی مالی دقت کو میں نے خوشی خوشی جھیل لیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ کٹھن دن تو میں اپنی پہلی مسافرتوں میں دیکھ چکا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ایک بار کالج سے واپس آکر جب میں نے کشمیر جانے کی ٹھان لی تھی، اور گھر سے اجازت نہیں لی تھی تو میں چوری ہی کشمیر کے لئے چل پڑا تھا۔ ان دنوں بلا ٹکٹ سفر کرنے کا حوصلہ کتنا زوردار تھا! اور پھر تین ماہ تک جوئیر کی تھی، ادھر کے گیت سننے کے لئے جو فقیری دھارن کی تھی وہ لاہور میں ان تازہ غریبی کے دنوں سے کہیں زیادہ سخت تھی۔

پہلی مسافرتوں میں میں اکیلا ہی تھا، جیسی زندگی خود چینی تھی، اُس میں پیش آنے والے سُکھ دکھ کو اپنی چیز سمجھ کر مست رہتا تھا۔ مگر اب تو میری

شادی ہو چکی تھی۔ اگر میں چاہتا بھی کہ اپنی بیوی کو سفر پر ساتھ لے جاؤں تو پتا جی کبھی اجازت نہ دیتے، اور اگر وہ ناراض ہو کر کہہ بھی دیتے کہ جا کر لے اپنی من مانی، تو بھی شادی میں اُسے باہر لے جانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ نئی نویلی بیوی سے بچھڑنا میرے لئے ایک کڑا سوال تھا۔ مگر پاؤں کا چکر زور مار رہا تھا۔

”مہارے بیٹے کے پاؤں میں چکر ہے، وہ کہیں ایک جگہ ٹپک کر نہ بیٹھ سکے گا۔ پاؤں کا چکر بڑا زبردست ہوتا ہے اور جس کے پاؤں میں قدرت نے چکر ڈال دیا ہو اُسے بس بے پروا پرندہ سمجھو۔ وہ اڑتا ہے اور دُور دُور کی ہوا کھاتا ہے، ان الفاظ کے ساتھ پچپن ہی میں ایک جیوتشی نے میری ماں کو فکر مند بنا دیا تھا۔ گو وہ جیوتشی یہ پیشین گوئی نہ کر سکا تھا کہ مجھے دیہاتی گیتوں کے لئے پرندہ بننا پڑے گا، مگر ماں دل ہی دل میں اس جیوتشی کی جادو بیانی کا سکہ مان رہی تھی۔

میں نے سوچا اس مسافرت کے دوران میں کوئی ایسی ترکیب ضرور نکال لوں گا، جس سے میں ہمیشہ بیوی سمیت سفر کرنے کا وسیلہ کر سکوں۔ شادی نے میرا نقطہ نگاہ بدل دیا تھا ”پیسہ چاہئے پیسہ“ یہ آواز تھی جو اکثر میرے دل پر اپنا اثر کرتی رہتی۔ بلا لحظ سفر کرنے کی بات کبھی کی ختم ہو گئی تھی۔ اب تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا سوال تھا۔ نوکری نہ کرنے کی میں نے قسم کھا رکھی تھی۔ پھر پیسہ کہاں سے آئے؟ مضمون نویسی کی جائے

دل نے جھٹ کہہ دیا۔ اخباروں اور رسالوں میں دیہاتی گیتوں پر مضمون لکھ کر زیادہ روپیہ پیدا کرنا مشکل ہے۔ یہ میں جانتا تھا۔ اور اب تک مجھے کبھی یہ بھی تو نہ سوجھی تھی کہ میں گیت کیوں جمع کر رہا ہوں بچپن ہی میں یہ شوق لگ گیا تھا۔ ہائی سکول کے ایام میں یہ دہسنے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ کالج کی زندگی بھی اس شوق کا کچھ سرمہ نکال سکی اور یوں ہی میں نے دیکھا کہ کالج کی آہ ہو امیری فطرت کے خلاف ہے۔ میں بھاگ نکلا اور لگا گھٹو منے اور گیت جمع کرنے۔ اب جب گیتوں پر لکھنے کا خیال گہیوں کے پودے کی طرح دل کی دھرتی میں روز بروز سہرا ہونے لگا تو سب گیتوں کے متعلق میرا شوق اور بھی جوان ہو گیا۔ مضمون نویس سے زیادہ پیسہ نہ آئے نہ سہی، جتنا آئے اُسی سے گزارہ کریں گے۔ آخر پیسہ ہی تو زندگی کا مقصد نہیں۔ وطن کے رسالوں میں لکھنا چاہئے اور ولایت کے رسالوں میں بھی، یہ تصنیف دیر سے دیر سے چل پڑنا گیا۔ اور ایک بات اور بھی تو تھی۔ چند ماہ اپنی بیوی کے ساتھ گزار کر میں نے ابھی وہ بات پیدا نہ کی تھی کہ وہ لمبی مسافت پر میری فٹیری میں شامل ہو سکتی۔ نہ میں پوری طرح اُس کا دل پڑھ سکا تھا اور نہ وہی میرے کام کی اہمیت سے واقف ہو سکی تھی۔ عذرائی کا آنے والا زمانہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چوری سے ایک دن بھاگ نکلنے کی بات میں نے مارے ڈر کے اُسے نہیں بتائی تھی۔ ان دنوں خاص کر بہن کے دیے والا گیت سننے کے

لئے میں ترس رہا تھا اور صرف للچا کر رہ جاتا تھا۔

جس دن صبح سے دو تین گھنٹے پہلے ہی میں نے جانے کی ٹھان رکھی تھی اُس سے پہلی رات چوبارہ میں بیچہ کر میری بھولی بیوی نے مجھے ایک دوسرا ہی گیت سنا دیا۔ یہ گیت پنجاب کی عورت نے میدان جنگ میں جانے والے اپنے سپاہی خاوند کو مخاطب کر کے گایا تھا:

”جے اٹھ چلیوں چاکری

نیلے گھوڑے والیا!

سالوں بوجھے پا!

جھتے تے آوے راز دی

نیلے گھوڑے والیا!

کڈھ کلیجھڑے لا!

”اگر تو جنگی نوکری کے لئے چل پڑا ہے تو اے نیلے گھوڑے کے سوار مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل۔ مجھے تو اپنی جیب میں ڈال کر لے چل یرتیم! جہاں کہیں راستہ میں رات پڑ جانے تو مجھے جیب سے نکال کر اپنے سینے سے لگا لیا کرنا!“

نہیں کہیں جنگ پر چلا تھا، نہ میرے نیچے نیلا گھوڑا ہی تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہوا کہ یہ گیت میرے لئے ہی بنا تھا۔ مگر دل تو

لچا رہا تھا برہن کے دیے والا گیت سُنے کو۔

ڈلہوڑی کے پہاڑی گاؤں مجھے بہت پسند آئے۔ ماں کے چپے پر جو رو
اور جو محبت کی پُرا زلفین رنگینی ہوتی ہے، وہ سب پہاڑ کے ایک ایک
جھونپڑے میں دیکھنے کو ملی۔ پہاڑی آبادی میدانی علاقوں سے کتنی مختلف
تھی۔ چمبہ کے گدی چرواہے جو ترانے چھیڑتے تھے وہ صرف پہاڑوں اور
وادیوں میں گونج کر ہی رہ جاتے ہوں، یہ بات نہ تھی، اُن کے گیت کھیتوں
کی طرح سادہ اور گھر کی روٹی کی طرح اچھے تھے۔ اور گدیوں کی حب الوطنی
کا تو میں جھٹ قابل ہو گیا۔ بھگوان مجھے اگلے جنم میں بھیر پیا بکری بھی بنائے
تو وہ مجھے چمبہ کے علاقہ میں دھولی دھار کی پہاڑیوں کے قریب ہی جنم
دے تو بہتر ہو، ان الفاظ کے ساتھ گدیوں کا ترنم دلوں تک پہنچ سکنے کا عالم
تھا۔ دھرم سالہ اور پالم پور کی سیر بھی کافی دلچسپ رہی۔ پھر منڈی ہوتا ہوا گلو
پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرا قلم ذرا زور سے چل رہا ہے، فوٹو گرافی کا شوق
الگ ابھر رہا تھا۔ گلو سے میں پیدل شملہ پہنچا اور پھر شانتی نیکیتن ہوتا ہوا
سیدھا آسام پہنچ گیا۔

آسام میں میری توجہ کھینچنے کے لئے کافی سامان تھے، مگر میں اب
ہجر سیدہ خاندن ہی۔ گیت لکھتے لکھتے کبھی گھر کا خیال آ جاتا، تو دل پیچھے ہٹتا
نظر آتا۔

پتا جی کا خط آتا تو دل کی مضبوطی اور بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔ بیوی کا خط الگ آتا۔ شروع شروع میں ان سب کا لہجہ اُداس کرنے والا نہ تھا، بعد میں ان کا پرسوز انداز بزداشت کی چیز نہ رہی، میں نے جواب دینا چھوڑ دیا۔ میری ڈاک پہلے گویائی میں سداوند کے پاس پہنچتی اور پھر جہاں کہیں میں ہوتا فحش تک کوٹائی جاتی۔ میں نے سداوند کو لکھ بھیجا کہ وہ پورے ایک ماہ تک میری ڈاک اپنے پاس روک کر پھر میرے پاس بھیجا کرے۔ پتا جی نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ بیوی برابر لکھتی رہی اور میں اُس کے چار چار خطوں کا جواب ایک ہی خط میں بھیجتا۔

پھر میں نے دیکھا کہ میری بیوی خط کے ساتھ لفاظ میں کچھ گیت بھی لکھ بھیجنے لگی ہے۔ میں نے سوچا یہ اچھی بات ہوئی۔ اب برہن کے دیے والا گیت وہ اپنے قلم سے ایک دن ضرور لکھ بھیجے گی۔ مگر دوسرے گیت پہنچتے رہے، وہ گیت، جس کا انتظار تھا، جس کے لئے دل بیتھار تھا، نہ پہنچا۔ آخر بہت انتظار کے بعد برہن کے دیے والا گیت بھی آ پہنچا۔ پہلے کی طرح اب کے لفاظ میں خط نہ تھا۔

اگلی صبح ہی میں منی پور ریاست کو خیر باد کہہ کر گویائی کے لئے چل پڑا۔ سداوند کو میں نے ”دیا جلے ساری رات“ گیت کی کہانی سنائی۔ وہ شاید

اسے سمجھ ہی نہ سکا، یوں ہی مسکرا دیا۔ اُسے مسکراتے دیکھ کر مجھے بھی ہنس دیا پڑا۔
پورے ڈیڑھ برس بعد میں گھر لوٹا۔ مجھے اُمید تھی کہ اب میری بیوی
مجھے اپنی زبان سے برہنہ کے دیے والا گیت ضرور سنا دے گی۔

مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
کہا ”اس پورے ڈیڑھ سال میں برہنہ کا دیا جلا کر پر تیم کا انتظار کرتی رہی
ہوں۔ اب پر تیم گھر آیا ہے۔ اب میں کوئی برہنہ نہیں ہوں، وہ گیت کیسے
گاؤں؟“ بات اُس کی محشک تھی۔ اور میں اگر سوال جواب پر اُترتا بھی تو
کس برتے پر؟

پچھلے ہفتہ میں ایک دوست کے ساتھ سیر کرنے نکلا تو مجھے اپنی کمائی
کا یہ ورق یاد آ گیا دیا جلتے ساری رات، یہ خیال میرے دل پر
چھا گیا.... بے رحم پر تیم! تم آتے ہی نہیں، رات بھر میرا دیا جلتا رہتا
ہے!.... نہ جانے کتنی بتیاں جل جاتی ہیں!.... تم آتے ہی
نہیں، بے رحم پر تیم!.... میرے دوست کو یہ گیت بہت پسند آیا نہیں نے
کہا ”مٹی کے دیے کو حقیر نہ سمجھنا“

مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک خیال یاد آ گیا۔ ”غروب ہوتے ہوئے
آفتاب نے کہا۔ کیا کوئی ہے جو میرے بعد میرا کام کر سکے؟“ مٹی کا دیا سر
اٹھا کر کہنے لگا۔ ”میں کوشش کروں گا۔“

کل رات جب میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ میں نے اپنی کمائی کا یہ ورق لکھنا شروع کر دیا ہے تو وہ بول اُٹھا۔ ”دیکھنا، یہ ظلم نہ کرنا۔ میں تو غریب ہوں کے دیے کا سہارا پا کر ایک نظم لکھ رہا ہوں۔“
میں نے زور دے کر کہا ”تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ تم بھی لکھو، میں بھی لکھوں گا۔“

”تم لکھو گے تو میں اپنی ادھوری نظم تمہارے روبرو ہی پھاڑ دوں گا۔“
”میں لکھوں بھی تو تمہاری نظم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا“ دوست اُلٹا مقابلہ میں آکر تمہاری نظم اور بھی چمک اُٹھے گی۔
”نہیں بھائی نہیں۔ میں یوں نہیں ماننے کا۔“

میں نے اُسے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا ”اچھا میں نہیں لکھوں گا۔ خوش ہو کرو وہ دیا جلے ساری رات پر پورے آدھ گھنٹہ تک تقریر کرتا رہا۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح کالج میں کوئی پروفیسر نظم پڑھا رہا ہو۔۔۔۔۔ یہ اُس عورت کا گیت ہے جس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی انتظار کی گھڑی ہے۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا اور میں بغور سن رہا تھا میں سوچ رہا تھا، کیا کوئی گیت لکچر کا محتاج ہو سکتا ہے؟

مگر اور تو اور میرے دوست کی نظم کا اب کیا حال ہوگا؟ میں نے تو اپنا دیا جدا ہی دیا ہے۔ اچھا ہو اگر میرے دوست کا دیا بھی جلے۔ میں ڈرتا ضرور

ہوں، کہیں وہ مجھے اپنے وعدے سے پھر ادیکھ کر یہ نہ کہہ دے۔" لو بھئی
یہ ہے میری نظم۔ اسے تم اپنے ہی ہاتھوں سے پھاڑ ڈالو۔

آسام کے سفر کے بعد بھی میں وہی پڑانا مسافر ہوں۔ کچھ نہیں تو نہ
سہی، دل تو ہے؛ اور پاؤں میں چکر کا زور بھی ہے۔ اب میری بیوی
میرے ساتھ رہتی ہے۔ خانہ بدوشی ہی میں ہمیں ایک تیسرا ساتھی بھی مل
گیا ہے؛ وہ ہے "کویتا" ہماری لڑکی۔

برہن کے دیے والے گیت سے کہیں اچھے گیت سننے کو مل چکے
ہیں۔ پھر بھی دل ہے کہ اُسی مٹی کے ٹٹماتے دیے کی طرف دوڑتا ہے
نہ میں پھر رسید ہوں نہ میری بیوی۔ پھر بھی ہم دونوں نہ جانے کیوں اُس
گیت کو گانے لگتے ہیں؟

عرصے سے سدا نہ نہیں ملا۔ بہت تلاش کی ہے، وہ مل جائے تو اُسے
ہم دونوں یہ گیت گا کر سنائیں۔ تب میں اُس سے پوچھوں، کہ آسام میں
وہ برہن کے دیے سے متعلق میری کہانی سن کر موروکھ کی مانند کیوں منہس

دیا نکھا؟

ایراوتی

شام کی سُرخ آسمان پر اور دھرتی پر خاموش ایراوتی۔ یہ نظارہ
مجھے مَن رکھتا ہے۔ چیت لیٹی ہوئی ریت پر میں بھی لیٹ جاتا ہوں۔
سو نظاروں کا ہے ایک نظارہ — ایراوتی کا کنارہ۔

صدیوں سے وہ یوں ہی بہہ رہی ہے۔ وہ اس دیس کی ماں ہے
لوگوں کے قہقروں کی امانت دار ہے۔ اُن کی تار تار سچ اُسے یاد ہو گی جیسے
کہہ رہی ہو، میں نے ہی انہیں ہنسا رکھا یا ہے۔ یاد نہیں آ رہا کہاں پڑھا
نفا کہ خوشی اور غم کے جذبے ہم میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی انہیں لگ

الگ نہیں کر سکتا۔ کب اور کیسے وہ ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سوچتا ہوں کہ ان لوگوں نے ان جذبول کو الگ الگ کرنا سیکھ لیا ہے۔ جدھر نگاہ اٹھاؤ، منہتے ہوئے چہرے۔ لوگ تو میں نے بہت دیکھے بھالے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اتنے خوش لوگ پہلے دیکھے بھی ہوں تو یاد نہیں آرہے۔ اتنی بھی کیا خوشی ہے؟

بادبان کی طرح بازو پھیلا کر میں ناچنے لگتا ہوں۔ پھر ریت پر خود ہی گر پڑتا ہوں۔ صدیوں سے ریت یہاں موجود رہی ہے صدیوں سے ایراوتی آدمی کو شانتی دینی آئی ہے۔ یہ فضا مجھے پسند ہے۔ زندگی بھرنی چاہئے ندی کی طرح، کھلی اور آزاد ایراوتی کی طرح۔

اچھا ہوتا کہ رنگوں سے ماند لے تک ایراوتی کے پانیوں پر سفر کیا ہوتا۔ اس میں پورے سات دن لگ جاتے ہیں۔ مگر میں ریل کے راستے پر پہنچا۔ اور ایراوتی کو پہلے پہل میں نے نہیں دیکھا۔

کا کا کا لیکر کے الفاظ میرے ذہن میں گونج اٹھتے ہیں۔ ایراوتی کہیں یا ایراوتی؟ میری سمجھ میں اس کا نام "ارانا" نام کی گھاس پر سے ایراوتی پڑ گیا ہے۔ اس کے کناروں کی توت بخش گھاس چرنے والے ہاتھی کو ہی ایراوت کہتے ہوں گے، یا پھر اندر کے ایراوت کی طرح بڑے ڈیل ڈول والی اور مست ہاتھی کی چال سے چلنے والی اس ندی کو دیکھ کر کسی بودھ

بھکشو کو یہ بات سوجھی ہوگی۔ بس اس کو ہم ایراوتی کہیں گے۔۔۔ ایراوتی کہیں ہندوستان میں ہوتی تو سنسکرت کے شاعروں نے اس کے بیان میں ایراوتی جتنی ہی لمبی چوڑی ندی بہا دمی ہوتی۔۔۔۔۔“

سبھی ندیاں پہاڑوں سے نکلتی ہیں اور وادیاں اور میدانوں کو پار کرتی ہوئی سمندر کی طرف بھاگی چلی جاتی ہیں۔ ایراوتی بھی دُور پہاڑوں سے آتی ہے۔

ایراوتی کا بحاس یہاں سے کتنی دُور ہے؟

سات سو میل۔

تو گویا یہ تیرہ سو میل لمبی ندی ہے؟

جی ہاں۔

پہلے پہل ایراوتی پہاڑوں کی گود سے نکل پڑی تھی تو کیا جانتی تھی کہ آگے چل کر مائی کا اور مالکہ اُسے اپنا پانی دے کر دُور دراز سفر پر وحکیل دیں گی۔ تیرہ سو میل دُور۔ شروع میں کوئی بھی دریا یہ جاننے کی پروا نہیں کرتا کہ اُسے کتنی دُور جانا ہے۔ وہ بہنے لگتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ دُور سے کسی کے گریٹ کی آواز مجھ تک پہنچتی ہے۔ جیسے ایراوتی کہتی ہو۔ یہ گریٹ اور کہاں ملیں گے؟ سچ کہتی ہے۔ ابھی کیا جلدی ہے؟

لے نوک ماتا (گجراتی)

پھر بیٹھ جاتا ہوں۔

خدا حافظ، ایراوتی اکل پھر ہی۔

میں ایراوتی سے اتنا متاثر ہوتا ہوں، پر کیا خود بھی ایراوتی کو متاثر کر سکا ہوں؟ پاؤں تیزی سے نہیں اٹھتے۔ جانا تو ہوگا۔ قیام گاہ پر سیربان انتظار میں ہوگا۔ ایراوتی کچھ نہیں بولتی۔ بولے بھی کیا؟

۲

اُشا کا نظارہ بھی مجھے مگن رکھتا ہے۔ اب سدانند بھی میرے ساتھ ایراوتی کے کنارے چلا آتا ہے۔ وہ بھی میری طرح ایک آوارہ پندہ ہے۔

ایراوتی لگنا رہی ہے۔

جو کتنا ہے سب کچھ کہ لے، ایراوتی!

سدانند کہتا ہے۔ ”آراکان“ اور ”پگچو یو“ کے پہاڑ ایراوتی کے

پُرانے سنتری ہیں۔

میں کہتا ہوں ”سب پہاڑ دھرتی کی خود داری کے ترجمان ہیں۔ آراکان اور پگچو یو بھی۔۔۔۔۔ ٹیگور نے کہیں لکھا ہے۔ گیت الپتا ہوا دریا تیز دوڑتا ہے۔ سب رُکاوٹوں کو چاندنا ہوا۔ پر پہاڑ دریا کی یاد میں کھویا کھویا سا کھڑا رہتا ہے اور اس کا پیار دریا کی طرف لپکتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آراکان اور پگچو یو دونوں ہمیشہ ایراوتی کے پیاری

اسی طرح کھوئے ہوئے سے کھڑے رہیں گے۔
 رنگوں کی طرت جانے پر پہلے کونسا مقام آتا ہے؟

امرا پور۔

امرا پور کے بعد؟

آبھا۔

امرا پور اور آبھا تاریخی شہر ہیں۔ ان کے بعد ”من جی آن“ بندرگاہ آتی ہے۔ یہ وادی کسی زمانے میں میدان جنگ رہ چکی ہے پھر ”کوکوچو“ شہر سے چند میل پرے چھندون ندی ایراوتی میں ملتی ہے۔ شان لوگوں کے علاقے سے آنے والی چھندون ایک غریب عورت کی طرح اپنا آپ لٹا دیتی ہے اور ایراوتی ٹھہری پکی سرمایہ دار! پھر پیگان آتا ہے۔ یہ پڑانا شہر ہے۔ ہزاروں پیگمڈوں کے کھنڈرات اس کی تاریخی حیثیت کے امانت دار ہیں۔ اس کے بعد ”سٹیم ناؤں لا“ کے مقام پر رکتا ہے۔ قریب ہی مٹی کے تیل کے کنویں ہیں۔ انگریز اور امریکن سرمایہ داروں نے اس سے بہت روپیہ پیدا کیا ہے۔ پھر ”سٹیم بڑے“ پر سکون علاقے سے گزرتا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ خاموش اور سنجیدہ بزرگوں کی طرح کھڑے ہیں۔ ساری فضا کسی گہرے خیال میں کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد

لے پیگمڈہ = بودھ مندر

سیٹمر بالترتیب "من چو" "جائے ٹامیو" اور "پروم" پہنچتا ہے۔ پروم کے بعد ایراوتی کئی شاخوں میں بٹ کر سمندر سے جا ملی ہے۔

سدانند سے کئی بار جھگڑ چکا ہوں۔ اُسی کی وجہ سے میں ریل کے رستے یہاں پہنچا۔ آگے کا سفر ریل میں طے کرنے سے باز آیا۔ یوں ہمارا سفر بد مزہ نہیں رہا۔ ہر چھوٹے بڑے سٹیشن پر ہم دو دو تین تین دن ٹھہرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ تعارفی چٹھیوں کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ رنگون سے تو اگلے سٹیشن کے لئے ہی ایک چٹھی ملی تھی۔ جب ہمارے میزبان نے مہاں نوازی کا جوہر دکھایا تو میں سمجھ گیا کہ چٹھی میں ہماری سچی جھوٹی تعریف کے پل باندھے گئے تھے، اور یہ مہاں نوازی ہر مقام پر نصیب ہوئی۔

سدانند سنیا سی ہے۔ اُس کا ادب مجھے ملحوظ ہے۔ سوچتا ہوں کہ وہ سنیا سی کیسے بن گیا۔ وہ مشرقی بنگال میں ایک دریا کے کنارے پیدا ہوا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ اُس دریا سے اُس کا بچپن اُسی طرح وابستہ تھا جیسا کہ میں ایراوتی سے وابستہ ہوا ہوں۔ اور پھر ایک طرح کی آوارگی کے خیال نے اُسے گھر چھوڑنے کے لئے ابھارا تو وہ چل نکلا۔ مگر وہ سنیا سی کیسے بن گیا؟ تلاش حق کے لئے؟ نہیں تو۔

کسی ندی کے نکاس تک ہو آنا تلاش حق سے کم وقعت نہیں رکھتا۔
ٹھیک کہتے ہو۔

یہاں سے بھامو تک کتنے دن کا راستہ ہے ؟
 تین دن کا۔

ایراوتی کا پاٹ تنگ ہونے لگتا ہے۔ کناروں پر ساگوان ہی ساگوان
 نظر آتے ہیں۔ گھنے جنگل ہیں۔ پرے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ٹیگور
 نے کہیں لکھا ہے۔ ”درخت، جو دھرتی کی بے قرار تمنائیں ہیں، پنچوں پر
 کھڑے آسمان کو جھانک رہے ہیں!“ کیا اس دیس کے ساگوانوں پر بھی یہ
 بات لاگو ہوتی ہے ؟ یہ درخت تو کاٹ ڈالے جاتے ہیں، کوئی پہلے کوئی
 پیچھے ! کوئی ان کا غمگسار نہیں۔ ہمدم نہیں۔ ماند لے کے بعد ”سن گن“ اور
 ”تھابی ٹاکن“ شہر آتے ہیں۔ پھر ”موپک“ جہاں لعلوں کی کانیں ہیں۔ آگے
 بھامو ہے، اس سے آگے سٹیم صرف برسات میں جاتا ہے اور وہ بھی مٹ کر
 تک۔ بھامو سے مٹ کر تک سمپانچ بھی ملتی ہے۔ مگر پانی تیز ہے اور بہاؤ
 کے اُلٹ جانا آسان نہیں۔ مٹ کر سے موڑ ملتی ہے۔ یہاں سے آٹھ
 میل پر ”مانی کا“ اور ”مالک“ ندیاں ایراوتی میں گرتی ہیں اور ایراوتی کا نکاس
 بھی قریب ہی رہ جاتا ہے۔

سٹیم کے پانی کا ٹھننے کی سرسراہٹ سُنائی دے رہی ہے۔ جی چاہتا ہے
 آج ہی ایراوتی کے نکاس کی طرف چل دوں۔ رسد اندامانتا نہیں۔
 لے دیسی کشتی

میٹرم سیٹی دے رہا ہے۔

چلو ٹکٹ لے لیں، سوامی جی!
آج نہیں۔

مجھے غصہ آ رہا ہے۔ ہر روز آج نہیں کی رٹ! اُس کے پاس کرایہ نہیں، پیسے میرے پاس بھی مشکل سے ایک ٹکٹ کے ہوں گے مگر کہیں درمیانی مقام کے دو ٹکٹ لئے جاسکتے ہیں۔ چلیں تو سہی۔ آگے دیکھا جائیگا۔ میٹرم کی سیٹی سُنتا ہوں تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ سداوند کی صلح بغیر میں قدم نہیں اٹھا سکتا، یہ وہ جانتا ہے۔

سنیاسی تو بغیر ٹکٹ کے بھی میٹرم میں سفر کر سکتا ہے!
میں ایسا سنیاسی نہیں۔

پیسے کا تعلق سفر سے اُسی طرح ہے جیسے بھاپ کا میٹرم سے۔ ایسے سادہ و سنیاسی تو ہزاروں نہیں لاکھوں میں جن کا نصب العین صرف بھیک مانگنا رہ گیا ہے۔ مگر سداوند تو ایک طرح کا مزدور سنیاسی ہے۔ کہیں کوئی تقریر کر دی اور مزدوری پہلے کھری کر لی۔ مگر کوئی کوئی انجن بعد میں دھتا بتا دیتی ہے۔ یا بوقت ضرورت کوئی انجن پیسے دے کر تقریر کرانے پر تیار نہیں ہوتی۔ میرا اپنا حال بھی سداوند سے بہتر نہیں۔ کلکتے کے ایک رسالے کو مضمون بھیجا تھا۔ ابھی تک اُس کی مزدوری نہیں آئی، اور اب تو

یہ شک ہو رہا ہے کہ وہ ناپسند نہ قرار دے دیا گیا ہو۔ ناپسند سی۔ اطلاع تو پہنچے۔
امید کتنی ہے شاید کل ہی منی آرڈر آجائے۔

اپنی تنگ دستی کو برداشت بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

سوچتا ہوں کہ خانہ بدوش ادیب اور مزدور سنیا سی سے تو ایراوتی کے قلع
ہی آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایراوتی گنگنا رہی ہے۔ شاید وہ میرے
نیال کی تائید کر رہی ہے۔

ہر شخص کا وجود اپنی جگہ ضروری ہے۔ یہ بے اعتنائی تو کسی طرح جائز
معلوم نہیں ہوتی۔ آخر کیوں بعض لوگوں کی زندگی بیکار اور بے لطف بنا
دی جائے؟ روزمرہ کی زندگی میں امیر اور غریب کے درمیان ایک خلیج
کیوں حائل ہوتی چلی جا رہی ہے؟ کب بدلے کی سماج کی حالت؟ سداوند
مسکرا رہا ہے۔ اُس کی دور رس نظر نئے زمانے کو قریب آتے دیکھ رہی ہے
یہ سب کچھ دیکھ کر اُس کے ذہن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی سوال پیدا ہوتا رہتا
ہے اور پھر شاید وہ خود ہی اپنے دل سے اس کا جواب پالیتا ہے۔

ایراوتی ہر نئے زمانے کا استقبال کرتی آئی ہے سو وہ ہستی رہی ہے بہنا
ہی زندگی ہے۔ اُس میں طوفان بھی آنے ہیں۔ اور اب کے سماج میں بھی
ایک بڑا طوفان آکر رہے گا۔ گنگناؤنی رجعت پسندی کی جڑیں اکھڑ جائیں گی۔
کوڑا کرکٹ بہہ جائے گا۔ اور پھر شاید ایراوتی کے پانیوں پر لوگوں کے

انسو کبھی نہیں گریں گے۔

۳

شام کے بڑھتے ہوئے صیر میں جب زندگی سمٹ جاتی ہے، ملاحوں کے گیت ہم پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ بادبان کی طرح بازو پھیلا کر سدا نند بھی کنارے کنارے بھاگنے لگتا ہے۔ پھر وہ خود ہی گر پڑتا ہے۔ ریت پر چت لیٹ جاتا ہے۔

پُرانی کتبوں میں سیاسی کے لئے یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ ایک مقام پر زیادہ نہ ٹھہرے۔ کہیں کہیں تو شاید یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایک رات سے زیادہ نہ رُکے۔ سدا نند اس کا پابند نہیں۔ آخر یہ پابندیاں کیوں لگائی گئی تھیں؟

شیمز سیٹی دے رہا ہے۔

چلو ٹکٹ لے لیں۔ اب تو روپے بھی آگئے۔

اتنی کیا جلدی ہے؟

سیاسی کو کسی مقام سے اتنی دل بستگی نہ ہونی چاہئے۔

میں ایسا سیاسی نہیں۔

مگر حق تو یہ ہے کہ مجھے بھی ایراوتی کے اس کنارے سے دل بستگی ہو گئی ہے۔ یہاں کتنا سکھ چُپن نصیب ہوتا ہے! اب تو جی چاہتا ہے کہ بھری

دوپہر کا وقت ہمیں آکر کاٹا کروں۔

کوئی گاتا ہے :

”تم ٹھہرو گے نہیں ؟

ہماری باتیں سزگے نہیں ؟

ہم ہیں ایراوتی کی لہریں !“

دن کا وقت ہوتا، تو میں ملاح کا چہرہ دیکھ سکتا اور اندازہ کر سکتا کہ

وہ لہروں کے بول سن کر کتنا متاثر ہوا ہے۔

”پانی سے بھرے ہوئے بادل ابھی برس پڑیں گے

منجھہار تو ابھی پار کرنا ہوگی۔“

مجھے یاد ہے کہ ایک پرانے ملکی ناچ میں اس دیس کی کنواریاں بازو

ہلا ہلا کر چپو چلانے کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اُن کے پھروں پر خوف

چھایا ہوا تھا۔ کشتیاں منجھہار میں تھیں اور سر پر بارش کھڑی تھی۔

موسیقی کی ترنگ تیرتی ہوئی نہ جانے کہاں تک چلی جاتی ہے :

”ایراوتی کی لہروں کی طرح

میری محبوبہ آزاد ہے !“

صدیوں سے اس دیس کی عورت آزاد ہے۔ مرد نے اُس کی آزادی

اور خوشی پر چھا پانہیں مارا۔ اکثر وہ اپنے خاوند کی وفادار رہتی ہے جب

دیکھتی ہے کہ وہ اُس کی طبیعت کے مطابق نہیں رہا تو گھاؤں کی پنچائیت کے
سامنے کھڑی ہو کر صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ آئندہ اُس کی بیوی بنی رہنے کی
پابند نہیں رہ سکتی۔ والدین سے ملی ہوئی جائداد پر اُسی کا حق رہتا ہے اور
وہ جسے پسند کرے اُس سے دوسری شادی کر لے۔

لاحوں کے گیت پہلے بھی بہت سُنے ہیں۔ یہ بھی نہ بھولیں گے:

"ایراوتی، اری اویری ایراوتی!"

ار میری محبوب ایراوتی!

اور سب ندیاں پیاری ہیں —

سب سے پیاری ہے ایراوتی!"

۴

"دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں

تیرے پانیوں پر او ایراوتی!

لاح کی زندگی بے بجائے خود ایک گیت

تیرے پانیوں پر او ایراوتی!"

۵

"سُندر کنواریاں ناچ رہی ہیں، مجھوم رہی ہیں۔

تیزی سے اکبھی دھیرے دھیرے۔

تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
 بتاؤ بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو!
 ہم ہیں مور اور تم ہو موریال
 مور مار ڈالے جانیں گے اور تم رویا کرو گی۔
 دریا کے اس موڑ پر یہ ناچ سیکھا تھا یا اُس پہاڑ پر
 جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے،
 تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
 بتاؤ بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو!

۴

"ایراوتی میں ہمارے آنسو سہاتے رہے ہیں، بھائیو!
 ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے،
 اور جب غریبی ہمارے گئے گھونٹ دے گی
 ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی۔"

۵

"بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا
 تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے۔
 ایراوتی! تُو چپ کیوں ہے؟ اُداس کیوں ہے؟

ہمارے آسوسشوق سے پہنچے جا۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم ہیں تیرے بیٹے

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تو ہے ہماری ماں

بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا

تیزی سے کبھی دھیرے دھیرے۔

ایراوتی گنگنا رہی ہے رشیدا اپنے بیٹوں کو آشیر باد دے رہی ہے۔ اس کی گنگنا سے متاثر ہو کر میری ڈاؤنڈول طبیعت میں توازن آگیا ہے، ایک خاص طرح کی وسیع النظری بھی میرا ذہن جو چند مہینوں سے پورا کبار خانہ بنا ہوا تھا۔ غیر ضروری اور انٹرنٹ چیزوں کا بے ترتیبیل گودم۔ اب بہت صاف ہو گیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر نئے نئے خیالات سوچتے ہیں۔ روح ذہنی جس ہو رہی ہے اور ہلکے ہلکے سے تاثرات بھی اس پر ایسی پابدار تصویریں کھینچ رہے ہیں جو شاید پہلے دماغ تک نہ پہنچتی۔ اور اب اند بھی جیسے میرے ذہن میں بیٹھ کر یہ تصویریں دیکھتا رہتا ہے اپنا گول مٹیالا سڑھلکا کر وہ بھی ایراوتی کے اس باز دیکھنے لگتا ہے اور کبھی میرے سر کے لمبے اور اُچھے ہوئے بالوں کی طرف جن کی لہریں شاید دھان کے ایسے پودوں کا نظارہ پیش کیا کرتی ہیں جنہیں ہوا تھپکیاں فے رہی ہو۔

صدیوں سے ودیوں ہی پہنچ رہی ہے۔ وہ برما کی ماں ہے میں اس سے اتنا متاثر ہونا ہوں پر کیا خود بھی اس سے متاثر کر سکا ہوں؟ خدا حافظ، ایراوتی! کل پھر سی۔

اُٹھو، سوامی جی، اب گھر کو چلیں۔

اتنی کیا جلدی ہے۔

مامونی

”آج تو دل چاہتا ہے کہ کسی غمناک گیت کا رس لیا جائے۔ یوں گیت تو سبھی اپنی اپنی جگہ دل کی سمٹی ہوئی دُنیا میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیتے ہیں، مگر غمناک گیتوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ انہیں گانا ہو تو سوز کی ضرورت پڑتی ہے، ازے ساز کی نہیں۔ زندگی میں غم ہے بھی زیادہ۔ تب غم کے گیت ہمیں کیوں نہ پسند آئیں؟“

یہ کہتے ہوئے میں اپنے پٹھان دوست کے سامنے بٹھ گیا۔ میرے کام میں اُسے دلچسپی تھی۔ پچاس سے اُوپر گیت، جو اُس کے ذریعہ میرے

بجوسے میں آئے تھے، مجھے بہت پسند تھے۔

وہ پشاور کے اسلامیہ کالج میں طالب علم تھا۔ پہلے پہل میں اُس کے ہوسٹل کے کمرے میں جا کر اُس سے ملا تھا۔ وہ اُس وقت کھانا کھا رہا تھا۔
 بولا۔ ”دسترخوان تانے مَنگور، تند می تانے گور!“ یعنی ”میرے دسترخوان کی طرف مت دیکھ، میری پیشانی کی طرف دیکھ۔“ یہ وہ الفاظ تھے جن کا تعلق پٹھانوں کی جہاں خاڑی سے ہے۔ ہر میزبان اپنے جہان کو یہی کہے گا کہ اُس کا دسترخوان اُس کی شریبی کا ترجمان ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جہاں خاڑی سے مُنہ موڑ لے گا۔ وہ خوش ہے اور اُس کی پیشانی پر اس خوشی کا دُور دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے تکلفی نے میری بھوک چمکا دی، اور اُس دن نہ صرف مجھے گیت ہی ملے جن کی تلاش میں وہاں پہنچا تھا، بلکہ جہاں خاڑی کا بھی نیا تجربہ ہوا۔

”غنناک گیتوں کا شوق تو مجھے بھی ہے، اچھا، ٹھہریے۔ میں ہوسٹل کے گیسٹ کیپر کو بلاتا ہوں۔ وہ ایک بڑھا آفریدی ہے۔ وہ مل جائے تو مزا آ جائے۔“ یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

وہ اکیلا ہی واپس آیا۔ بولا ”وہ آفریدی ملا نہیں، اطمینان رکھیے۔“ اُس نے کہاں جانا ہے، یہیں کہیں ہوگا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو کہا ہے کہ وہ اُسے تلاش کر کے میرے کمرے میں بھیج دے۔ وہ آگیا تو بھی

بھر گیت سن لیجئے۔

کمرے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے سگریٹ کا ملبا سا کش لگا کر کہا ”غم! ہاں، زندگی میں غم نہ ہو تو ہماری خوشی کا شاید کچھ مطلب ہی درہ جائے.... غم میں نے بہت نہیں دیکھا۔ مگر میں اس کی قیمت سمجھتا ہوں۔ تبھی تو غم کے گیت مجھے بھی اچھے لگتے ہیں.... شیلے بھی تو یہی کہتا ہے۔“
”دنیا کی بہت ساری شاعری غم کی شاعری ہے۔“

”بجا ہے۔“

”ہمیلے نے ٹھیک ہی نو لکھا ہے کہ جب آدمی کی دنیا میں دکھ نا اُمیدی اور تڑپ اُونچ نیچ پیدا کرنے سے رہ جائیں گی، تب آدمی کے پاس کہنے سُننے کو اور گانے کو کچھ نہ رہ جائے گا اور ہمارا ادب بانچھ ہو جائے گا۔“
”دھرتی کی شاعری زندگی اور موت کی شاعری ہے، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ سکھ اور دکھ اس کے دو کنارے ہیں۔“

”مجھے اس وقت ٹیگور کی ایک نظم یاد آرہی ہے۔ ایک آدمی مدت تک سورگ میں رہا اور پھر اُس کے نیک اعمال مدھم پڑ گئے۔ اُسے دھرتی پر لوٹ آنا پڑا۔ نظم کا نام ہے ”سورگ سے اوداع“۔ سورگ چھوڑنے والے وقت تک آدمی بہت گھبرایا۔ وہاں وہ اُنسو دیکھے گا، اُسے یہ اُمید نہ پھٹی۔ سورگ تو خوشی کا مقام ٹھہرا۔ وہاں دکھ کا کیا کام؟ وہ سوچنے لگا کہ اگر سورگ پر

دھکے کا سایہ پڑ جائے تو اُس کی خوبصورتی کتنی بدل جائے، روشنی میلی ہو جائے،
 ہو امیں اُداس اُس سرسما جائیں، اندی بہتی بہتی اُداس نغمہ پیدا کرتی چلے روڈن
 دن کے بعد شام کی لالی ظاہر ہو۔ پر ٹورگ میں یہ سب نہیں ہونے کا یہ
 جُدا جُدا رنگ تو دھرتی کے جھٹنے میں آئے ہیں۔ آند وہاں تڑپ کے ملا ہوا
 ہے اور تبھی وہ اتنا خوبصورت ہو گیا ہے۔ ٹورگ کی اسپر اپریم تو کرتی ہے پر
 اُسے کبھی کوئی ٹیس نہیں اُٹھتی۔ نہ اُسے کبھی کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے ہجر
 میں جو انتظار رہتا ہے وصل کا وہ اُسے کیا جانے؛ دھرتی پر ہجر اور وصل کے
 ذریعہ عشق پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اور ساتھ ہی مجھے براؤننگ کی
 وہ نظم بھی یاد آ رہی ہے جس میں ایک آدمی بہشت سے لوٹ کر اپنے دوستوں
 کو بتا رہا ہے کہ اس دھرتی پر زندگی بہت سُندر ہے۔ وہ کتنا جاتا ہے۔
 نہ بہشت میں کسی چیز کی کمی ہے نہ وہاں کچھ ترقی ہی ہوتی ہے، نہ ادل بدل
 ہے نہ شروع ہے نہ آخر۔ اچھے بُرے میں وہاں کوئی تمیز نہیں۔ سبھی تو
 ایک سے لگے ہیں وہاں۔ کوئی دُکھی نہیں۔ سبھی مکمل ہیں۔ میں تو اس سے
 گھبرا اُٹھا۔ پھر میرے من میں محبت اور نفرت کا، اُمید اور یاس کا الجھن طر اسما
 اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں دُنیا کی زندگی کے لئے لپچا اُٹھا۔ میں چاہتا تھا جُدا جُدا
 رنگ۔ سب کچھ یکساں دیکھنے سے میں اُوب گیا تھا۔ اُونچ نیچ والی لانا انتہا
 زندگی میں تفرقوں کے بیچوں بیچ ایک یگانگت دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے

آدمی کے دل کو۔ او آدمیو! تمہیں شک ہو کرتا ہے، امید بھی اور ڈر بھی تمہارا
دل چھوڑا کرتے ہیں۔ تم مرتے بھی ہو تو کیا حرج ہے؟ زندگی کا مقصد نظر
سے اوجھل تھوڑا ہی ہو جاتا ہے۔ میرے دل میں یہ خیالات جاگ اٹھے
تو ایک فرشتے نے مجھے بتایا۔ ارے اورین! یہاں کا تمہارا وقت ختم ہوتا
ہے۔ اب تمہاری جگہ دھرتی پر ہوگی!.....“

اتنے میں وہ آفریدی گیٹ کپیر آ پہنچا۔ ”شیر گل! آج وہ ماؤنی کا گیت
سنا دو نا۔ دیکھو انکار نہ کر دینا۔“ میرا دوست بولا۔
”بس ایک گیت؟ بس ایک ہی؟.....“

”بس ماؤنی کا گیت۔“

”ماؤنی کا ہی کیوں؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آج ماؤنی کا گیت ہی ہو جائے۔“

گیٹ کپیر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ شاید گیت کے الفاظ کو اپنے ذہن
میں ٹھیک طور سے بٹھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خواب کی سی خاموشی
چھائی ہوئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”ماؤنی کیا ہوئی؟“

میرا دوست بولا۔ ”ماؤنی ایک عورت تھی، بے چاری بے گناہ تھی.....“
”اُس پر کیا مصیبت آپڑی تھی؟“

”بے چاری کو شیر عالم نے مار ڈالا!“

”شیر عالم نے؟..... وہ کون تھا؟“

”وہ اُس کا خاوند تھا۔“

”آخر کوئی وجہ تو ہوگی؟“

”اُسے یہ شک گزرا کہ مائونی کا چال چلن میلا ہو گیا ہے، اور خلیل

سے اُس کی آنکھ لڑ گئی ہے۔ اسی شک میں وہ بھرپور اٹھا۔ مائونی کو

اُس نے مار ڈالا۔“

پھر اُس نے گیٹ کیپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب تو شروع کرو“

اُردو پیشتر اس کے کہ گیت شروع ہوتا اُس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ گیت

”چار بیت“ کی قسم کا ہے اور محمد حسن نامی دیہاتی شاعر نے پہلے پہل اسے

تیار کیا تھا۔

گیٹ کیپر نے گانا شروع کیا:

”ت اے دا گلو لختہ ارا پرے و تے دختہ

خار استہ در پورے اورد شو

زکالا دے پ زوانی

ارمان دے مائونی!

ت اے پ خن پورا، مڑوندے بھری تورا

پ زہن کے دے شولے
 پ ہر طرف باندے خوارے دی
 پ مچ دے ستارے دی -
 ار پسین مچ بدن دے بار دا گما زبویکے زاگ
 پتائے و لگا ووداغ، پتائے وکڑا مکبری
 سنگا در پیچہ شولا سحنت ات اے دا گلو لختہ
 سحنتی شولا در پیچہ خبر دے دی بیخہ

خبر دے صنمے گرضے ادے ویوانتی
 ارمان دے ماؤنی!
 ت اے و گلو لختہ

۲۔ خبر دے شولے پ حالہ، پ غے غ دے لور ملا
 تقدیر گور سبالا

درتہ جوڑا واد اوختہ ات اے دا گلو لختہ
 خبر پ تا علم شو، چے گل پہ نینگ قلم شو
 ظالم پ شیر علم شو
 ظالما شیر علما، بے گناہ کرے مرگوئی

ارمان دے ماموئی !

ت اے دا گلو لختہ

۳۳۔ تاچے کرڈولقین، ادبل ٹوئے تا بے این
خُپل زان دے کرڈولقین، خپل جان دے کرڈولقین
د چادے س وکرڈولقین، ات اے دا گلو لختہ
رُسا شے پ کور، دُخنا دے شوآ خور

.

لُنا درتا بکھو، شوئے ماشوا د ماموئی

ارمان دے ماموئی !

ت اے دا گلو لختہ

۳۴۔ لاشموشان سے جاڑے ات کُلی لاڑے گوآرے
اہب د برخا لاڑے، خلیل خوتا کو—
کرے سوال دوئیے بدبختہ، ات اے دا گلو لختہ
تقدیرے دے د لانا، کچا گرما خانا

.

سُرے شے شیرِ عمات پ توپ جرمئی

ارمان دے ماموئی !

ت اے دا گلو لختہ

۵۔ سُرے د جڑپ سر شے ات ٹول زیر د جبر شے

ل دے در دا نا جبر شے، بس کر ما مد اسنا!

د غمؤ نوبالختہ ات اے دا گلو لختہ

پ ٹول نا دا گئی، کے، عندلیب زاڑی مرغان

بے ننگا شو یاران

بے ننگا زمان شولا شہیدہ ماٹونی

ارمان دے ماٹونی

ت اے دا گلو لختہ

گیت ختم ہوا تو گیت کیس پر نے سوالیہ نکا ہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ

اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر میرے دوست نے اُسے جانے نہ دیا۔ ابھی کیا جلدی ہے؟

بیٹھو۔ اور میری طرف سے اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ گیت کے گانے کا ڈھنگ

مجھے بہت پسند ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بڑی ہلکی سی چمک دکھائی دے

گئی اور وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے جذبات

کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں گیت کا ترجمہ لکھنے کے لئے بے قرائہ ہو رہا تھا۔ پہلے میرے دوست

نے مجھے ایک ایک سطر کا لفظی مفہوم سمجھا دیا۔ اور پھر میں نے اُس کی مدد سے

ترجمہ لکھ لیا :

”تُو پھولوں کی ٹہنی تھی۔ تو سخت سے گر پڑی
تیرا حُسن تیرے لئے آگ بن گیا
بھر جوانی میں تُو مر گئی

ماٹوئی! تجھ پر ارمان ہے!
حُسن میں تُو پوری تھی، مصری تلواروں کے سے تھے تیرے بازو
تیری پیشانی تُو رانی تھی
ہر طرف (یہ نور) چھیدا ہوا تھا۔
تیرا چہرہ گویا ایک ستارہ تھا۔

۱۔ چاندی (کے زیور) سا تھا تیرا چہرہ۔ بدن باز کاسا، وہ پھیل خور تیرے
اور تیرے خاوند کے درمیان، کوڑا بن گیا۔

اُس نے تجھ پر داغ لگا دیا اور ٹھیری کی
تجھے کیسی سختی پیش آئی۔ تُو پھولوں کی ٹہنی تھی
تجھے کیسی سختی پیش آئی پیاری! اصل واقعہ کی تجھے کچھ خبر نہ تھی
تجھے کچھ خبر نہ تھی پیاری! مستانی ادا سے تُو ہوم رہی تھی۔
ماٹوئی! تیرے لئے ارمان ہے!

تُو پھولوں کی ٹہنی تھی

۲۔ حال (کا بھید) منجھ پر روشن نہ ہوا۔ تیری گود میں تیری نگین پچی تھی۔
 اگلے روز ہی تجھے تقدیر کا تماشہ دیکھنا تھا۔
 تیرے خلاف بہت دنوں سے سازش ہو رہی تھی، تو پھولوں کی ٹہنی تھی
 دنیا کو تب پتہ چلا جب پھول کو تلوار سے کاٹ ڈالا گیا۔
 شیر عالم ظالم ہو گیا۔

ظالم شیر عالم! تو نے ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔
 ماٹونی! تیرے لئے افسوس ہے
 تو پھولوں کی ٹہنی تھی
 ۳۔ تو نے اُس (چنچل خور) پر یقین کر لیا، (شیر عالم!) تو دوسرے کے نتائج

ہو گیا۔
 اپنی جان کو نگین کیا، اپنی جان کو رسوا کیا۔
 کج بخت! اسی کا کیا بگاڑا کرنے: (ماٹونی!) تو پھولوں کی ٹہنی تھی۔
 اپنے گھر میں تو بدنام ہوا۔ تیری بہن تیری دشمن بنی
 اُس نے چنچلی کھائی، تو نادان بچہ بن گیا
 ماٹونی! تیرے لئے ارمان ہے
 تو پھولوں کی ٹہنی تھی

۴۔ اب بچوں کی طرح رو رہا ہے تو بھوکے ہوئے کو چاٹنا چاہتا ہے تو۔

پانی اپنے بند سے گزر گیا۔ غلیل نے تو صرف اُس سے تباہ کو کا
سوال کیا تھا، او بد بخت! (مامونئی!) تو بچھڑلوں کی ٹہنی تھی
رہے چارمی کی (تقدیر میں یہی بدا تھا، ابھی دوپہر نہ ہوئی تھی، خزاں
کا موسم تھا۔

شیرِ عالم! خدا کرے تیرے جسم میں جرمنی کی توپ سُورخ کر دے
مامونئی! تیرے لئے ارمان ہے
تو بچھڑلوں کی ٹہنی تھی

۵۔ تیرے دل میں سُورخ ہو جائے، تیرا سب کچھ برباد ہو جائے
تاکہ تُو (مامونئی کے) درد سے واقف ہو جائے۔ بس کر محمد حسن!
اب غم کے نیچے کو چھوڑ دے۔ (مامونئی!) تو بچھڑلوں کی ٹہنی تھی
ناواگئی گاؤں کی بلبلیں رورہی ہیں —
یار لوگ بے ننگ ہو گئے
زمانہ بے ننگ ہو گیا، مامونئی شہید ہو گئی
مامونئی! تیرے لئے افسوس ہے۔

تو بچھڑلوں کی ٹہنی تھی

پوچھنے پر پتہ چلا کہ گیٹ کیپر کو مامونئی کا ایک اور گیت بھی یاد ہے، اور
جب اُسے کہا گیا کہ وہ دُوسرا گیت بھی سُنا ڈالے تو وہ بولا ”تب کیوں کہا

تھا۔ بس ایک گیت؟“

میرے دوست نے کہا ”اس وقت ہیں یہ تھوڑے خبر تھی کہ مامونی کا دوسرا گیت بھی تمہیں یاد ہے . . . اچھا، اب دیر نہ کرو اور گیت کیپہر نے دوسرا چار بیتہ شروع کیا :
”دُنیا گئی داغا دورانِ دئی

مڑشوا مامونی پے ہر چا کرٹے ارمانِ دئی

سنگا یمنہا خُوا، دُنیا گئی داغا دورانِ دئی

مڑشوا مامونی چے پر شنبہ پہ مثلِ حُورا وا -۱

خاست کے خاپے رے، پ وطن کے مشا ہورا وا

داصل پراج گے د باج وڑ، پ کالو پورا وا

چل بن پے چوگ لئی وکڑا چے مے ان پ دے یوزوانِ دئی

سنگا یمنہا خُوا، دُنیا گئی داغا دورانِ دئی!

مڑشوا مامونی پے ہر چا کرٹے ارمانِ دئی

بن پے چو غلئی وکڑا چیل پ ردی ورتارا بجا شو -۲

راگے رائے مامونی کڑا اُس د دے دمرگ طمع شو

داخاست و حن وڈا مامونی خُوا رے دغاں شو

او دے مامونی جوڑناں دمرگ سامانِ دئی

- سنگ بننا خوا، دُنیا گئی داغِ دورانِ دنی
- مرثوا مامُونی پے ہر چاکڑے ارمانِ دنی
- اورے مامُونی تا سو چار راتا سہاں کڑے
- تا سودے سود و شعی ماغریبا پے حلا لا کڑے
- داغا ماشوم زوئے خورازدے زماں خوا لا کڑے
- چے اے او دینم پ سترگو درنگِ ساعت لے ہجرانِ دنی
- سنگ بننا خوا، دُنیا گئی داغِ دورانِ دنی
- مرثوا مامُونی پے ہر چاکڑے ارمانِ دنی
- چے اے ولی دو پسترگو مامُونی نارے سرے کڑے
- لتنے نکا وی دخیال جا مے اے دوسرے کڑے
- تو نوے یے ہیل تئا ڈیرو خنے دے سپیرے کڑے
- سوک چے کور کے دواغلا ساتی سختے گزراں دنی
- سنگ بننا خوا، دُنیا گئی داغِ دورانِ دنی
- مرثوا مامُونی پے ہر چاکڑے ارمانِ دنی
- سوک چے کور کے دواغلا ساتی حیا ب اے تلی دی
- یو دبل پ سر خچلے کوئی کچا بدلی دی
- گورا اے مامُونی تا بے گناہ دے وزلی دی

کڑے لگ چہیت کچے ترکانِ فضلِ رحمانِ دئی
سنگا نیہا خُور، دُنیائِ گئی دا غا دُورانِ گئی

مرٹھا مامونئی پے ہر چاکرے ارمانِ دئی . . .

چار مہینہ ہونے پر بھی اِس کے گانے کا ڈھنگ پہلے گیت سے جُدا
محسوس ہوا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اُسے فضلِ رحمان بڑھئی نے تیار کیا تھا۔ وہ ناوِ گئی
گاؤں میں رہتا تھا، جہاں مامونئی کے سُرال تھتے۔

میں نے گیٹ کیسپر کا شکریہ ادا کیا، اُسے جلد می تھی، وہ چلا گیا۔ اور میں
اپنے دوست کی مدد سے گیت کا ترجمہ لکھنے لگا :

”یہی اِس دُنیا کی ریت ہے !

مامونئی مرگئی، ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے

کیسی بے وفا ہے یہ ! یہی اِس دُنیا کی ریت ہے !

۱۔ مامونئی مرگئی۔ سچ بچ وہ ایک خُور تھی۔

حُسن کے لحاظ سے وہ ایک پری تھی، اپنے وطن میں مشہور تھی

اصل میں وہ باجوڑ کی پراچکے نسل سے تھی، گمنوں سے لدی ہوئی

اُس کی سوت نے چُغلی کھائی کہ ایک نوجوان اُس پر عاشق ہو گیا ہے

کیسی بے وفا ہے یہ ! یہی اِس دُنیا کی ریت ہے

مامونئی مرگئی، ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے

۲۔ سوت نے چٹلی کھائی۔ اپنے پرانے جمع ہو گئے
انہوں نے ماموئی کو گھیر لیا اور وہ اُس کی موت کے خواہشمند ہو گئے
رنگ اور حُسن دونوں ماموئی کے لئے غم کا باعث بن گئے
ماموئی بولی۔ میری موت کا سامان ہو گیا!

کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اِس دُنیا کی ریت ہے۔

ماموئی مر گئی، ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے

۳۔ ماموئی بولی۔ تم لوگ میرے لئے چھری تیز کر لو

تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے، مجھ غریب کو حلال کر لو

میری محصوم سچی کو میرے پاس لے آؤ

بیں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ تو لوں، تھوڑی دیر بعد تو مجھے

اس سے جدا ہونا ہے۔

کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اِس دُنیا کی ریت ہے!

ماموئی مر گئی۔ ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے۔

۴۔ جب ماموئی نے زچکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اُس نے افسوس

کا لغو مارا۔

اُس کی ٹانگیں پھڑپھڑانے لگیں اور (عالمِ تصور میں) اس نے اپنے

خون سے لٹھ پتھ کپڑے دیکھ لئے۔

ادجڈائی! کاش تُو نہ ہوتی۔ تُو نے بہت سے گھر برباد کئے
جو بھی گھر میں دو بیویاں رکھتا ہے اُس کا وقت مُشکل سے کتنا ہے
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اس دُنیا کی ریت ہے!

ماٹونی مر گئی۔ ہر کوئی اُس کے لئے انوس کر رہا ہے.....
۵۔ جو بھی گھر میں دو بیویاں رکھتا ہے، اُس کی عزت چلی جاتی ہے۔
ایک بیوی دوسری پر خنجر چکھاتی ہے، کسی نے یہ دیکھا ہو ر تو وہ
اس سے ہونے والا نقصان سمجھ سکتا ہے۔

دیکھو ماٹونی بے گناہ ہی ماری گئی
فضل رحمان بڑھئی نے تو صرف اس کی تھوڑی سی صفت کی ہے
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اس دُنیا کی ریت ہے!
ماٹونی مر گئی۔ ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے.....

پر سے مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جب دن
وہاڑے ماٹونی مار ڈالی گئی تھی اس سورج نے بھی غمناک واقعہ ضرور دیکھا ہوگا۔
میرا دوست بولا "یہ دونوں گیت ہمارے وطنی گیتوں کے اچھے نمونے
ہیں۔ اور گو ہمارے پڑانے رواج کے مطابق ہر چار بیتہ کے آخر میں اُس
کے پہلے شاعر کا نام قلم رکھا جاتا ہے، اس کا درجہ عوام کے دوسرے
گیتوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوسرے گیتوں کی طرح اس کے

الفاظ میں بھی کانٹ چھانٹ اور اضافے کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔
میں نے کہا ”بجائے“

”مامونئی کو ہونے بہت عرصہ نہیں گزرا۔۔۔ یہ انگریزوں کے ادھر آنے کے بعد کا واقعہ ہے۔۔۔۔۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں جنگِ یورپ کے لوں کی بات ہوگی۔ پینے گیت میں یہاں دیہاتی شاعر نے کہا ہے۔۔۔ شیرِ عالم اُدا کر تیرے جسم میں جرمی کی توپ سوراخ کرے اسی بات کا اشارہ کرنا نظر آتا ہے۔“
”بجائے“

”ایک مامونئی پر ہی بس نہیں۔ ادھر اکثر ایسی غنک وارداتیں ہو جایا کرتی ہیں۔“

”تو ایسے اور بھی گیت ملیں گے

”کیوں نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہر ایک واقعہ گیت میں نہیں سما پاتا اور نہ ہر ایک گیت ایک سا کامیاب ہی ہو سکتا ہے۔“

میں سوچنے لگا کہ مامونئی کوئی عام عورت نہیں بلکہ عصمت کی دیوی ہوگی، تبھی اُس پر ہوئے ظلم سے تڑپ کر دو شاعروں نے ایک ساتھ گیت تیار کئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر پُرسوز، ایسے کہ دل کی گہرائیوں میں اُترتے چلے جائیں۔

مامونئی کے خاوند پر مجھے بہت غصہ آیا۔ لوں قالون کو ہاتھ میں لینے

کا اُسے کیا حق تھا؟ کبھت! دیوانہ! مرد کتنا اندھا ہو
 سکتا ہے! اُس کی حماقت کتنا ظلم ڈھاسکتی ہے! مامونی سن رہی عورت بھئی
 اُس لئے اُس کی عصمت پر اتنا شک کیا گیا ”مرد کی حماقت بڑی“
 میں نے بلند آواز سے کہا۔

میرا دوست گھڑی بنا بیٹھا تھا۔ بولا ”مرد کو برا نہ کہو . . . بیگیت
 بھی تو مرد لے بنا لئے ہیں عورت نے نہیں کتنے درد بھرا ہوا
 ہے ایک ایک لفظ میں . . .“

ابھی کو بتا سسرال نہ جائے گی

کو بتا میری بیٹی ہے۔ لوریاں سنتے اُسے چار سال ہو گئے۔ اب اُس نے پانچویں سال میں قدم رکھا ہے۔ دیکھتا ہوں لوریاں مُسنے کا اُسے بے حد شوق ہے، اور اب تو وہ ان کی زبان بھی سمجھنے لگی ہے۔

ان میں اُسے ماں کا پیار ملتا ہے۔ کتنی کشش، کتنی شیرینی پاتی ہے وہ اس مادری محبت کی سادہ شاعری میں، یہ کوئی اُسی سے پوچھے۔ پر شاید وہ جواب نہ دے سکے۔ لوریاں مُسنے مُسنے جب وہ ایک خاص انداز سے مسکراتی ہے، تو مجھے ان کا صحیح لطف حاصل ہوتا ہے۔ مسکراہٹ پر تو لے یہ مضمون ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا۔

بچوں کا حق ہونا ہی چاہئے اور لوریوں پر بھی۔
 ابھی اگلے ہی دن وہ صند کرنے لگی تو اُس کی ماں بول اُٹھی ”کوئی
 کیسے بنائے اس ذرا ذرا سی بات پر رُو نہنے والی لڑکی کو!“
 میں نے پاس سے جھٹک دیا ”کوئی لوری گادو، اسے خوش کرنا
 بھی کچھ مشکل ہے؟“

ماں کا رل بھی غیب چیر ہے۔ یہ دھرتی پر کیسے آگیا، سوچتا ہوں
 اس کی تخلیق سُرگ میں ہوئی ہوگی۔ پھر اُس خالق نے سوچا ہوگا۔ چلو
 اسے دھرتی پر بھیج دیں تاکہ اس کے بس سے وہاں بھی ایک سُرگ بس جائے
 میرے ذرا سے اشارے پر ماں کا غصہ دُور ہو گیا، ماتا بھری لڑی اُڑ آئی،
 ”کویتا آوے! نہیں لگن جاناں؟“
 کویتا دسے پیریں کڑیاں،

میں وارج پچھاناں!“

— کویتا آتی ہے۔ پر میں نے کیسے جان لیا، کویتا کے پاؤں میں
 کڑیاں ہیں۔ میں جھنکار پہنچانتی ہوں۔

پنجابی لوریوں کی ایک دلچپ خصوصیت یہ ہے کہ انہیں گاتے ہوئے ہر
 ماں ان کے مصرعوں میں اپنے بچے یا بچی کا نام شامل کر سکتی ہے۔ نہ جانے
 لے زیور کا نام۔

یہ لوریاں کتنی پرانی ہیں۔ ان کے ساتھ کویتا کا نام شامل ہو جاتا ہے تو محسوس کرنا ہوں کہ اُسی کے لئے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ انہیں سن کر اُس کی آنکھیں پھٹک اٹھتی ہیں۔

”کویتا آئی کھڑکے، پینڈی آئی دھم
روٹی دیاں چوڑکے، چُتی لَبن سی چُتم“

”کویتا کھیل کر آئی ہے۔ راس کے آگے دودھ دم دھام ہوتی آئی۔ گھی سے چمپڑی، برتی روٹی دیتی ہوں اُسے۔ اُس کی چُتری کو چُوم لیتی ہوں۔“
”سننی کویتا لوری

تینوں دیاں گنتے دی پوری!“

”سن کویتا! (یہ میری) لوری، گنتے کی پوری دیئے دیتی ہوں تجھے۔“
”کویتا دی ماسی آئی اے

دودھ ملائی لیا فی اے“

”کویتا کی خالہ آئی ہے، دودھ اور ملائی لائی ہے وہ۔“

کویتا مٹھائی کے لئے ضد کر رہی تھی، لوریوں میں الجھ کر وہ مٹھائی کو بھُول بیٹھی۔ اب اُس نے لوریوں کے لئے ضد شروع کر دی۔ پر ضد کرنے میں اُس کی ماں بھی تو کم نہیں۔ بولی ”کہاں سے گائے جاؤں اس کے لئے زت نئی لوریاں، بھلا میں کیسے بن جاؤں لوریوں کی مشین؟“

میں نے کہا ”لوری گانے میں کونسی طاقت خرج ہوتی ہے؟“
 جب بھی لوریوں کی بات چلتی ہے میں ہمیشہ کویتا کی حمایت کیا کرتا ہوں۔
 بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے خود ان سے ایک گونہ لگاؤ ہو گیا ہے، ان کے
 میٹھے بول سُنتا ہوں تو بچپن کے سُپنوں میں کھو جاتا ہوں کبھی کبھی تو
 سوچتا ہوں کہ میرا اپنا بچپن کویتا کا روپ دھار کر لوریاں سُنانے لوٹ آیا ہے
 بالتراک کا وہ خیال کہ دُنیا کا سب سے میٹھا گیت وہ لوری ہے جسے ہم صبح
 زندگی میں ماں کے مُنہ سے سنتے ہیں، مجھے کبھی نہیں بھولتا۔
 اُدھر کویتا اپنی ضد میں کامیاب ہو گئی۔ اُس کی ماں کا مُسکراتا ہوا چہرہ
 کویتا کی فتح کا ترجمان تھا۔ میں نے کہا ”کوئی اچھی سی لوری گانا“
 ”لوریاں ساری اچھی، کویتا بول اُٹھی کبھی بُری نہیں۔“
 اُس کی ماں گانے لگی :

”اڈُنی چڑیئے! اڈُوے کاواں !!“

کویتا کھیدے نال بھراواں ؛

— اُڑجاری چڑیا، اُڑجاریے کوئے، کویتا اپنے بھائیوں کے ساتھ
 کھیل رہی ہے ؛

کویتا نے جھٹ پوچھا ”میرے بھائی کہاں ہیں ماں؟“
 ”گلی محلے کے لڑکے جو تیرے ساتھ کھیلنے آتے ہیں سب تیرے بھائی ہیں۔“

”اور لڑکیاں میری بہنیں ہیں؟“

”ہاں، ہاں“

پھر اُس کی ماں گانے لگی :

”کویتا بی بی رانی

سوہریاں دے گھر جانی“

۔ کویتا بی بی رانی ہے، وہ سُسرال میں جانے والی ہے۔

میں نے کہا ”یہ لورمی نہ گایا کرو۔ ابھی کویتا سُسرال نہیں جائے گی۔“

بیٹی کی شادی سے سبکدوش ہو کر ماں باپ کو ہمیشہ خوشی ہوتی ہے مگر

مجھے اُس وقت بیاہی جانے والی لڑکی کے جذبات کا دھیان آ گیا تھا۔ پہلے

گھر کو الوداع کہتے ہوئے لڑکی کے دل میں اک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ مرد

اکثر اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ پنجاب کے ایک دیہاتی گیت میں کسی

لڑکی نے کہا ہے ”مُنڈے آپنے تھائیں رہندے، نی دھیاں کیوں بنائیاں

رت نے؟“۔ یعنی لڑکے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں۔ ہائے اُخلنے

بیٹیوں کو کیوں پیدا کیا؟

مجھے ننھوڑی دیر کے لئے باہر جانا پڑا۔ واپس آیا تو کویتا بدستور لوریاں

سُنے جا رہی تھی۔ میں نے کہا ”شاباش، بچھی! ایسے ہی کیا کرو۔ یہ لوریاں تو

ہنی ہی تیرے لئے ہیں۔“

کویتا کھلکھلا کر منہ پھینسی۔ لوری جاری رہی :

”کویتا دے مال، گڑ وند رکھائے

کھنڈاں دے پالے جھل متھے نوں آئے“

۔ کویتا کے بال بڑھانا شروع کرتے وقت ہم نے گڑ بانٹا تھا کھن

سے پالے ہوئے بال جھول کر اب ماتھے پر آ پڑے ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ کون جانے پہلے پہل کس ماں نے اپنی بچی کے بال بڑھانا

شروع کرتے وقت اس خوشی میں گلی کے پتوں میں گڑ بانٹنے کا رواج ڈالا ہوگا۔

پھر میں نے کہا ”دیکھو جی! یہ نیاز مان ہے، گڑ کے دن کبھی کے بیت گئے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہی کہ اس لوری سے گڑ کا لفظ نکال دو اس کی بجائے ’کھنڈ‘

(کھانڈ) کہنا ہوگا۔۔۔ اور تم دیکھو گی کہ کھنڈ اور وند کی ہم آہنگی لوری کے

الفاظ میں ایک نیا ہی رس بھر دے گی“

کویتا بول اٹھی ”کھانڈ اچھی ہے، گڑ بھی اچھا ہے۔ صبح میں یہ گڑ کھایا تھا“

بس اتنی سی بات سے کویتا نے اپنی ماں کی طرف داری کر دی جس نے

شاید مجھے چھیڑنے کی خاطر نئی لوری شروع کی :

”کویتا آوے مٹیوں

گڑ کڈھاں کوزی مٹیوں!“

”کویتا دکان سے آرہی ہے اس کے لئے میں کورے مٹکے سے گونہکا

بہی ہوں۔“

کویتا نے لوریوں کی مانگ ختم کر دی تھی۔ سوچا اُسے ایک لوری اور سُسرال
دوں۔ اُس کی ماں میری رمز پہچان گئی۔ بولی ”شوق سے رکھا دیجئے اس لابی
چھو کری کو کہ وہ ضد پر قائم رہے۔“

”اور نہیں تو وہ کو کو والی لوری تو بڑی نہ رہے گی۔“

”آپ سنا دیں“

”اچھائیں سُنا دیتا ہوں“ یہ کہتے ہوئے میں نے لوری شروع کی:

”چچی چچی کو کو کھائے

دُڈھ ملایاں کویتا کھائے!“

— ”آنکھوں کی چپیز“ کو کو کھائے گی اور دُڈھ ملائی کھائے گی کویتا!

یہ ”کو کو“ نہ جانے کیا بلا ہے۔ روتے بچے کو چُپ کرانے کے لئے اکثر کہا جاتا
ہے، چُپ کو کو آجائے گی! بچے ڈر کر چُپ ہو جاتے ہیں اور ”کو کو“ کو آنے کی ضرورت
ہی نہیں پڑتی کسی نے اس فرضی ہستی کو دیکھا نہیں۔

”اچھی لوری ہے!“

”ہاں اکبروں نہیں؟“

لاکھ کوئی انہیں بے معنی کہے، جو جگہ لوریوں کو مل چکی ہے وہ اب اُن سے

کوئی چھین نہیں سکتا میرا تو خیال ہے کہ ان کے مُرنے پہ کئے ل میں راگ کا احساس بیدار کر دیتے ہیں اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مائیں اکثر اسی وقت تک لوریاں گاتی ہیں جب تک بچہ جھولے کا پابند رہتا ہے تو مجھے اُن کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جب بچہ ذرا ان کا مطلب سمجھنے لگے اُس وقت تو لوریوں کو دُ گنے شوق سے گانا چاہئے۔ مانا کہ زندگی کے حل کو لوریاں سمند کی لہروں کی طرح چومتی ہیں اور ان کے بعد آنے والے لگیتوں کے ریلے پہلے سب نشانات مٹا ڈالتے ہیں، پر مجھے یقین ہے کہ اگر ماں اپنے بڑے بچے کے لئے بھی لوریاں جاری رکھے تو یہ اُس کے دل پر بعض دیر پا نشانات چھوڑ سکتی ہیں۔

”کویتا کی ماں بولی“ اب میری آواز بنسری کی طرح صاف تو ہے نہیں۔۔۔۔۔
میں نے بات کاٹ کر کہا ”اور میری ہی آواز پر کب بنسری کا دھوکا ہوتا ہے؟“
میں جانتا تھا کہ میں نے اُسے ایک ادھ اور لڑی گانے کے لئے اکسا دیا ہے۔ بولی اچھا تو سنو؟
”کویتا دے سوہرے بیڑے بناواں“

جی اور درجاوے جھبے مل آواں!

— کویتا کے سُسُرا ل میں کہیں نزدیک طے کروں گی۔ جی اُداس ہونے پر جھٹ اُسے مل آیا کروں گی؛

میں نے کہا جس بات کے میں تمہیں منع کرتا ہوں، وہی تمہیں پسند ہے۔۔۔۔۔ ابھی کویتا سُسُرا ل نہیں جائے گی۔

اپنی جوڑو کو سمجھا

”شبائش، بیٹا! اللہ تیری عمر دہرا کرے... جلدی قدم اٹھا، سیا نے دلہا!“
 اُس وقت مجھے کسانوں کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو وہ پیارے سہیل
 کو بچپن میں دیکھتے وقت منہ سے نکالتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں میں نے انہیں کثرت
 سن رکھا تھا اور اس وقت وہ اپنی ساری حرکت اور تاثیر کے ساتھ میرے
 ذہن میں بیدار ہو گئے تھے۔

ہم بہت دُور نکل آئے تھے۔ کھیتوں میں بل چل رہے تھے۔ ایک بوڑھا
 کسان اپنے سہیلوں کو بچپن میں دیکھتا تھا۔ راستے میں میں نے تصویر کا دوسرا رخ بھی

دیکھ لیا تھا، ایک بیل بڑی طرح پٹ رہا تھا۔

دوار کا ناتھ کو متوجہ کرتے ہوئے میں نے کہا ”بیلوں کو یوں پچکارنا بھی ان سے کام نہ کالنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر بیل کے قدم آگے نہ اٹھیں، یا وہ ذرا سست نظر آئے، تو یہی کسان، جو اب یوں یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اُس کا سارا پیار اُسی کے لئے ہے، بے رحمی پر اُتر آئے، اور شاید یہ بھی نہ دیکھے کہ کم مارنے سے گزارہ ہو سکتا ہے تو پھر زیادہ لال پیلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

دوار کا ناتھ بولا۔ ”کسان خود بھی ان بیلوں سے اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ فرق اتنا ہی ہے کہ یہ بیل نہ روتے ہیں، نہ مہنتے ہیں اور نہ زیادہ بڑبڑاتے ہیں، بس خاموشی سے مار کھاتے رہتے ہیں اور خود کسان بہت چلاتے ہیں۔ مگر زمیندار کا بھو اُن کے گلے میں شاید ہمیشہ کے لئے پڑ گیا ہے۔ اب زمیندار کو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بدلے میں اپنے نیچے کام کرنے والے غریب بیلوں پر اپنا غصہ نکالتے رہتے ہیں۔“

اُس کا پورا نام تھا مادی کیر سے دوار کا ناتھ بی۔ اے۔ مگر میرے لئے وہ صرف ارکا ناتھ تھا۔ اُس کی مدد سے میں نے اُس کی زبان کے بہت سے گینڈوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اکثر وہ اس بات پر زور دیا کرتا تھا کہ کرناٹک کے دیہاتی گیت بے حد سادہ ہیں، اسی لئے وہ تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں

اور یہی عمدہ گیتوں کی شناخت ہے۔

میں نے اُسے بتایا کہ ایک بوڑھا بیل ایک پنجابی گیت میں اپنے مالک کے یہ شکایت کرتا ہے کہ بڑھاپے میں اُسے منڈی میں لے جا کر بیچ آنے کا خیال سرے سے بے رحمی پر مبنی ہے۔ منڈی میں اُسے کوئی بوجھ ہی خرید سکتا ہے۔ اس سے بہتر تو یہ ہو کہ وہ اُسے گھر پر ہی رکھے اور سبز گھاس کی پچائے چند ٹوکھے تنکے ہی کھلا دیا کرے۔

وہ بولا ”ہو سکتا ہے، بوڑھے بیل کا ایسا کوئی گیت ہمارے علاقے میں بھی مل جائے۔ مگر بیل کا ایک دوسرا گیت مجھے یاد ہے وہ یتیمی ناہارو کہلاتا ہے۔ یتیمی ہم بیل کو کہتے ہیں اور ہارو گیت کا ہم معنی ہے۔ یتیمی ناہارو، یعنی بیل کا گیت۔ مگر مضمون کے لحاظ سے میں اسے بیل کی شکایت، کتنا مناسب سمجھتا ہوں۔“

”کس کی شکایت کی ہے بیل نے؟“

”اپنی مالکین کی۔“

”پوری بحث تو وہ گیت سننے کے بعد ہی کی جا سکتی ہے مگر تینا ظاہر ہے کہ ہمارے دیہاتی گیتوں میں صدیوں سے ہل میں جتنے والے خاموش بیل بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ خود خاموش رہ کر سیلوں نے اپنی زبان کسانوں کو

دے دی ہے۔

”سچ کہا... بات یہ ہے کہ ہمارے کسائوں کی زندگی جیسا کہ میکسم گورکی نے پڑانے روس کے متعلق لکھا ہے، ’ایسی غریبی اور جہالت میں گزرتی ہے کہ غم اُن کی تفریح کا ایک بہانہ بن جاتا ہے۔ دُکھ اور ہپتا سے وہ بچوں کی طرح کھیلتے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ کام سے تھک جاتے ہیں تو بد نصیبی کے تیغ پر آرام کرتے ہیں۔ آگ ہے اُن کے لئے کھلونا اور زخم ہے اُن کے جسم کا زیور... اور اپنے غم کے علاوہ کسان اپنے پریشیوں کے غم کو بھی اپنی تفریح کا کچھ کم بہانہ نہیں سمجھتے جس طرح خاموش میل نے اپنی زبان اپنے مالک کو سوپ دی ہے اُسی طرح پڑانے زمانے میں کہنے ہی دوسرے جانداروں اور سپر پودوں تک نے اپنے بھید بھرے جذبات اُن پریشیوں کو سوپ دینے تھے جو جنگلوں میں آشرم بنا کر رہتے تھے۔ قدیم ہندوستان کی شاعری اس کی امانت دار ہے۔“

سامنے ایک کسان اپنے بیل کو بچکا رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”یہ کسان کیا کہہ رہا ہے؟“

”جلدی جلدی چل، میرے ندی!“ وہ کہہ رہا ہے ”جیسے خود وہ کوئی

شہو ہو۔“

ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پے ایک مندر نظر آ رہا تھا۔ شاید

یہ شوکا مندر تھا۔ مندر کا شوکیا جانتا تھا کہ کھیتوں میں ہل چلا تے وقت اپنے بیل کو بچکا رتے ہوئے دھرتی کا بیٹا بھی دیوتا بن جاتا ہے، اور پھر جب وہ ایک لمبے یا چھوٹے وقفے کے بعد اُسی زبان سے گالیاں دینے لگتا ہے تو اپنے بڑے سے بڑے دیوتا سے بھی نہیں ڈرتا۔

دوار کا ناتھ اپنا گیت سنانے لگا:

”مالی آ ہوڑی آگا

ننا کنی لے مائے وندا ماٹسی کونڈیا

نا ہوگی اوندا

تینی دھننا رتن درا

کلی کلی لے ہوڑا دیو

نم جیوا ہو داوو کنی لاس کا!

— ماگھ مہینے کا ہل چلا تے وقت

مجھ سے محبت کے ساتھ سب کام کرایا

میں نے جا کر اناج کی ایک بال کھالی

تم نے مجھے پتھروں سے مارا

میری رُوح کی تلاش (پریت) کو چلی گئی!

میں نے حیران ہو کر کہا: ”تو بیل مر گیا!“

”نہیں تو۔ اس بند کی آخری سطر میں بیل کتا ہے کہ اُس کی روح کس کے پتھر دے مارنے سے تڑپ اٹھی اور کیلاش پر بت کو چلی گئی تاکہ بٹو سے تنکایت کرے۔ بٹو پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بیلوں پر ہونے والے ظلم کا انسداد کیا کرے، ورنہ اُسے نندی بیل پر سواری کرنے کا کیا حق ہے؟“

مگر میرے ذہن میں میرا اپنا خیال گونج رہا تھا۔ تو بیل مر گیا! رگیت کی آواز سن کر چند کسان اپنے ہل چھوڑ کر ہمارے قریب آ گئے۔ اُن میں سے ایک جو بہت بوڑھا تھا، میرے چہرے کی طرف پر غور لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اپنے مرحوم دادا میرے سامنے آ بیٹھے ہیں۔

دوار کا ناٹھنے نے دوسرا بند شروع کیا:

”ناووندا رہتی دا

نااونا بیلادیدا

ناہوگی اونا

ہوڑے دھنٹا بن درا

بڑا بگھے ہوڑا دیو

نم جیوا ہو دارو کئی لاس کا!“

— ’میں نے ہی یہ کھیت بویا

میں نے ہی اس میں اناج اگایا

میں نے جا کر ایک

بے دانوں کی بال کھالی

تم نے مجھ پر لگاتار ڈنڈے برسائے

میری روح کیداش پر بت کو چلی گئی!

میں نے کہا: "بیل کی پکار کتنی غمناک ہے۔ صدیوں سے یہ پکار اسی

طرح بلند ہو رہی ہے۔ اب تک یہ آواز شاید نندی بیل کے کانوں تک

نہیں پہنچی، ورنہ کیا وہ اپنے اوپر سواری کرنے والے دیوتا سے کہہ کر اپنی برادری

والوں کا دکھ درد ہمیشہ کے لئے مٹا نہ ڈالتا؟

دوار کا ناتھ نے میری طنز بھانپ لی اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

وہ بوڑھا کسان ایسی چمکتی ہوئی نگاہ سے میری آنکھوں میں جھانک رہا

تھا، جیسے اُس نے میری بات سمجھ لی ہو اور کہہ رہا ہو کہ شو اور نندی کے

متعلق یوں خیال کرنا پاپ کرنے کے برابر ہے۔

دوار کا ناتھ نے تیسرا بند شروع کیا:

”ہتی کلا کر دوا اندرا

ننا مڑ دی اتا ماری تر د ویا لا

تتا گولا گا بتندرا

کھنڈ گا تھوڑا

تُنڈی ناتن دُصورو

نم جیوا ہودا اور کئی لاس کا !

— ’تم مجھے بنو لے کھلانے کو کہتے ہو

تمہاری جو رو (یہ سن کر) دوسری طرف مُنہ پھیر لیتی ہے۔

تم اُس سے دس ”گولا گا“ بھرانا ج کھانے کو کہتے ہو۔

وہ ایک ”کھنڈ گا“ کھا ڈالتی ہے

اِس اُٹھڑا البیلی کو تم نے کیوں ڈال رکھا ہے گھر میں ؟

میری رُوح کی تلاش پر بت کو چلی گئی !

دوار کا ناتھ نے بتلایا کہ ”گولا گا“ ایک طرح کا پیمانہ ہوتا ہے اور کھنڈ گا

کا ناپ بیس ”گولا گا“ کے برابر ہوتا ہے۔

میں نے کہا ”اِس بندین بیل کی آواز ایک قدرتی صاف گوئی کا پہلو

لئے ہوئے ہے۔ جب رنج انتہا کو پہنچتا ہے تو اکثر آدمی پاگل ہو جاتا ہے

مگر بیل کی صورت میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں پہنچ کر وہ بھول گیا کہ خود کس

نے اُسے اناج کی ایک بال کی خاطر پتھروں اور ڈنڈوں سے مارا تھا۔

اپنے خاندان سے یہ سن کر کہ بیل کو بنو لے کھلانے چاہئیں، کسان کی بیوی

نے مُنہ پھیر لیا، بس یہ بے توجہی اُسے ایک آنکھ نہ بھائی۔ اور بیل یہ بھی

چاہتا ہے کہ اُس کے مالک کے گھر کا خرچ کفایت سے چلے۔

دوار کا ناخن اگلا بند گارہا تھا:

”ہنڈی آ کر ڈو اندر

رہتا مڑ دی مُو گئے مُراد لا

کھنڈ کا تیندرا

اکھنڈ کا تینتھا

تندر سی ناتن دُھوڑو

نم جیوا ہو داو وکئی لاس کا؟

مے تم مجھے کھلی کھلانے کو کہتے ہو

مہتاری جوڑو رہیں کر ہناک سکڑ لیتی ہے۔

تم اُس سے ایک کھنڈ کا بھراناج کھانے کو کہتے ہو

وہ دو کھنڈ کا بھراناج کھا ڈالتی ہے

اس اٹھڑا لیبیسی کو تم نے کیوں ڈال رکھا ہے گھر میں؟

میری رُوح کی تلاش پر بت کو چلی گئی!

سب کسان ققہہ لگا کر سنس پڑے۔ دوار کا ناخن چھینپ کر بولا۔ ”یہ

لوگ کچھ نہیں جانتے۔ ان کو اتنی سمجھ ہی نہیں کہ گیت کے اندرونی سوز کو پہچان

سکیں۔ مجھے خوب یاد ہے جب میں نے پہلے پہل ایک گاؤں میں اسے سنا

تھا تو میری آنکھیں منک ہو گئی تھیں۔

اتنی خیر تھی کہ اُس نے یہ باتیں کنٹری زبان میں نہیں کہی تھیں کہ
ہماری طرف غور سے دیکھ رہے تھے، اور وہ بوڑھا کسان تو یوں تک رہا
تھا جیسے میرے آپار دیکھ لے گا۔
دوار کا ناتھ گارہا تھا؛

”اگلی درامینڈی نادنا

ہچی دراکل نادنا

دیورامندی نا

پرساد نا آدا

متیانا کا دینا؛

نم جیوا ہودا و وکئی لاس کا!

— (رفع حاجت) کرتا ہوں تو گوبر متیا ہوتا ہے

گوبر تنھاپنے سے اُپلے بنتے ہیں

دیوتا کے سامنے کا

پرساد (بھی یوں) میری مدد سے متیا ہوتا ہے۔

پھر اور کس کس کام آؤں؛

میری رُوح کی تلاش پر بہت کچھ چلی گئی!

دوار کا ناتھ نے بتلایا کہ چوتھی سطر میں جس پر ساد کا ذکر آیا ہے وہ بھسم یا بھجوت
ہے جو آخر ایلوں سے بنتی ہے اور مندروں میں اکثر بھگنتوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔
پھر وہ آخری بند گانے لگا:

”ست راؤگ لادینا“

میتنی دراکیرا دینا

ہیگلا میا لاڈنا

بار کو لانا ہوا

متیاتا کا دینا؛

نم جیوا ہودا و کئی لاس کا!“

— ”مرجاتا ہوں تو کھال مہتا کرتا ہوں

پہننے کو (اسی سے) بچتے بنتے ہیں

رہم بیلوں کے (کندھوں پر لہرانے والا چابک (بھی)

اس کھال سے) میں ہی مہتا کرتا ہوں

پھر ادر کس کس کام آؤں؛

میری رُوح کی تلاش پر بت کو چلی گئی!“

گیت ختم ہو گیا۔ مگر کسان ہلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ دوار کا ناتھ سے پتہ

چلا کہ یہ گیت ”ملی گئے ڈنڈے“ (چنبیلی کا گچھا) نامی دیہاتی گیتوں کے مجموعے

میں، جو کہ دھارواڑ سے ”کاپے ریو پنا ٹوڑو“ نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، موجود ہے۔ پھر کافی وقفے کے بعد وہ بولا: ”بے زبان جاندار پر آدمی کتنا ظلم کرتا ہے! اپنا یہ خیال اُس نے کنٹری زبان میں کسانوں کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ باقی سب تو خاموش رہے، مگر وہ بوڑھا بوڑھے نے لگا۔ پتہ چلا کہ وہ دوار کا بچہ کی رانے سے متفق نہیں ہے۔“ کسان بڑا سہی اور اُس کی جو رو بھی بُری تھی، مگر یہ گیت کسی بیل نے بخور اُسی بنایا ہے؟ اور خود کسانوں پر کیا کم ظلم ہوتا ہے۔ بیل کا تو صرف بہانہ ہے۔ سچ پوچھو تو یہ گیت ہم نے اپنے متعلق بنایا ہے۔۔۔۔۔“ کچھ اس طرح کا خیال اُس بوڑھے کسان نے ظاہر کیا۔

پھر کسان عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے کھانا لئے آنکلیں۔ بوڑھے کسان نے مٹھی بھر بھات پاس آ بیٹھے بیل کے منہ میں ڈالا، تو اُس کی جو رولال پیلی ہو کر بولی ”بڑا آیا ہے دیا کرنے والا۔ پہلے اپنی بھوک تو مٹائے۔“

وہ کسان شہزادی

ایک شہزادی تھی، بڑی خوبصورت۔ سات سمندر پار ایک جزیرہ تھا، دُور بہت دُور۔ وہاں ایک مدت سے شہزادی اپنے پلنگ پر پڑی سو رہی تھی۔ اُسی شہزادی کی تلاش میں ہماری کہانی کا شہزادہ سرگرداں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُسے اپنی دُہن بنا سکے گا۔ پھر جب وہ سُکرایا کرے گی، اُس کے مُنہ سے پھول جھڑا کریں گے۔

شہزادہ اتنی دُور کیوں جا رہا تھا؟ اُس کی اپنی سلطنت میں کیا ایسی ایک بھی لڑکی نہ تھی جو اُس کے سُنوں کی رانی بن سکتی؟ آج وہ شہزادہ

کہاں ہے؟ وہ اپنی سلطنت میں لُٹ آیا ہے یا سمندروں کے سینوں پر بھٹکتا پھرتا ہے؟ آج وہ ہمارے گاؤں میں آجائے اور چھٹو کا سرسوں کے پھول کو شرمانے والا نکھڑا دیکھے، اُس کے گیت سنئے، تو وہ کہہ اُٹھے: اے کسان شہزادی، دھرتی کی بیٹی! میں تجھے پیار کرتا ہوں، آج سے سات سمندر پار کی اُس نامعلوم شہزادی کو کبھی یاد نہ کروں گا۔

نام بے کوشیا، مگر پیار سے ماں اُسے چھٹو کہہ کر بُلاتی ہے۔ اُس کی سہیلیاں بھی اسی نام سے بُلاتی ہیں اور میں بھی۔ بسنت پنچمی کے دن میں اُس کے گھر گیا تھا تو اُس نے مجھے پانچ چھ گیت سنائے۔ اُس کا چاند سا نکھڑا کتنا معصوم نظر آ رہا تھا میں نے کہا تھا ”چھٹو آب سیانی ہو رہی ہے۔“
”اودول کیوں نہ آیا بشر“

جد رنگ سی سرھوں سے دے پھل ورگا؟

”تب کیوں نہ آیا، اودوست! جب میرا رنگ سرسوں کے پھول سا تھا۔ چھٹو گا رہی ہے۔ کیا وہ ہماری کہانی کے شہزادے کو مخاطب نہیں کر رہی؟ مجھے وہی گیت پسند آتے ہیں جن کی جبر و دھرتی میں گہری چلی گئی ہو جن سے گاؤں کی دلی کیفیت کا پتہ چل سکتا ہو۔ سپی کے سینہ میں جیسے موتی پروان چڑھتا ہے، گاؤں کے سینہ میں گیت پلتے ہیں۔ گاؤں کی دُہن اور بیٹی، جن پر خود موسیقی و شاعری کی دلیویاں خوشی خوشی اپنے جوہر لٹا دیتی ہیں“

اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں پیار کا اتھاہ سا گرھپائے، آج کے ترقی پسند ادیب کا تعارف و طبیعت کی زرد دار لہر سے کراتی نظر آتی ہیں۔

بیگم نے کہیں لکھا ہے۔ ”ہم ٹھکڑا تے پتے ہیں، ہماری سرسراہٹ ان طوفان کا جواب ہے، مگر تم چُپ چاپ کون ہو؟“ میں صرف ایک پھول ہوں!“
 چھٹو جی ضرور ایک پھول ہے اپنی ماں کے گھر میں، اور خاص کرتجن نام کی اُس محفل میں، جہاں گاؤں کی لڑکیاں باہم مل کر چرخہ کا تنے بیٹھتی ہیں۔
 ہاں، وہ چُپ چاپ نہیں رہتی۔ وہ گایا کرتی ہے، شرماتے شرماتے۔ ایک دن اُس کی شادی ہوگی، اور اُس کی ماں اُسے پکار کر کہے گی:

”مُندا دیکھ لے سرہوں دے پھل ورگا“

اگتے تیرے بھاگ لچھے!“

۔۔۔ سرسوں کے پھول سا دُولھا دیکھ لے، پھر آگے وہی ہوگا اور لچھی!

جو تیری قسمت میں پدا ہے!

یہ لچھی کون تھی؟ اس سے ہمیں زیادہ سروکار نہیں۔ لچھی اور چھٹو میں میں زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ آج چھٹو یہ گیت خود گارہی ہے، اُس کی سہیلیاں سڑ میں سڑ مل کر اُس کا ساتھ دے رہی ہیں۔ مگر سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ کیا چھٹو کی ماں اُس کے لئے سرسوں کے پھول سا دُولھا ڈھونڈ بھی سکے گی یا نہیں!

”جو بندھ گیا سو موتی!“ سماج کتا ہے۔ شادی ضروری ہے۔ لڑکی کو والدین کا گھر چھوڑ کر سڑک میں جا کر رہنا ہی ہوگا۔ مگر پھلو گارہی ہے:

”مٹدے اپنے تھائیں رہندے،
فی دھیاں کیوں بنائیاں رب نے؟“

”لو کے اپنی اپنی جگہ رہ سکتے ہیں۔ ہٹے ری! خدا نے لڑکیاں
کیوں پیدا کیں؟“
سینہ بہ سینہ چلا آنے والا یہ دیہاتی گیت چھٹو کی سوانح عمری کا ورق بن
گیا ہے۔

وہ چرخہ کات رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ ایک دن اُسے اپنے
ماں باپ کا گھر چھوڑ دینا ہوگا :
”نکے چٹو کی نکک دے تیرے
رکھ لے کو آری بابلا!“

”میں تمہارے گھروں کے کھیتوں کو سیراب کیا کروں گی، اتنا
جان! مجھے کنواری ہی رہنے دو!“
پہلے چھٹو گاتی ہے۔ پھر اُس کی سہیلیاں اُس کے ساتھ مل کر گاتی ہیں۔
کبھی کسی نئے گیت کا جنم ہو جاتا ہے۔
چھٹو کے گیت چھٹو تک محدود نہیں۔ ہاں، گیتوں کے انتخاب
میں اُس کا رجحان ضرور نظر آ جاتا ہے۔

پنجابی شعرو نغمہ کی زبان سے۔ صدیوں سے پنجابی گیت زندہ ہیں۔
میں سوچتا ہوں کہ جب تک پنجاب کے میاںوں میں دریا بہتے ہیں، اس کے
کھیتوں میں گیہوں اور باقی اناج پیدا ہوتے ہیں، اور جب تک تنجمن

میں عورتیں باہم مل کر چرخہ کاتتی ہیں، یہ گیت منہ نہیں سکتے۔ خاص کر وہ گیت جنہیں سن کر بچپن کے سچے جاگ اٹھیں، جن کی طراوت و صہرتی کی ہزاروں اور دریاؤں کی روانی سے مل کر بنی ہے۔

ہمارے گاؤں میں گیتوں کا کال نہ ہوا ہے نہ ہر گا چھلورے مزے دار گیت چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں ایک نئی رونق آنی لگنی پیدا کر دیتے ہیں۔ خدا کی عام خلقت کے بنیادی ترنم اپنی آپ بیتی بنا کر ہمیں زندگی اور موت کے درمیان پر لا پہنچاتے ہیں۔ دیہاتی گیتوں کا خمیر اکثر چرخہ کی گھٹوں گھٹوں سے مل کر بنا ہے :

”چرخے دی گونج سن کے

جوگی اتر پہاڑوں آیا !“

چرخے کی گونج سن کر جوگی پہاڑ سے نیچے اتر آیا !

گیت کی مختصر سی زمین میں نہایت کفایت سے کام لیا گیا ہے۔ عورت کی شاعری کی یہ منہ بولتی تصویر نئی لحاظ سے ایک کامیاب چیز ہے۔ کون جانے یہ گیت پہلے کس کی زبان سے نکل پڑا تھا؟ چھلورے گاتی ہے تو اس میں اپنے دل کی آواز ملا دیتی ہے۔ عورت کا یہ گیت ہر ایک دوشیزہ کے غور و خن میں ایک نئی چمک پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ وہ حسینہ ہے اور چرخہ کی گونج کے ذریعے اپنے خن کی خبر پہاڑ کے جوگی تک بھیج سکتی ہے۔

کون جانے یہ جوگی کس پہاڑ پر رہتا تھا؛ چرخہ کی گونج اُس کے کان میں پہنچی تو اُس نے سمجھا کہ کائناتنے والی ضرور کوئی حسینہ ہے۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر وہ نیچے اُتر آیا اور اپنے خیال کا سچ جھوٹ دیکھنے کی غرض سے چرخہ کائناتنے والی لڑکی کے پاس آ پہنچا۔ تو کیا اس سے جوگی کی پتیا جنگ ہو گئی؟ جوگی چرخہ کائناتنے والی عورت کے پاس آ گیا تو کیا ہوا؛ گاؤں کی بوہٹی بدستور چرخہ کائناتنے رہی ہوگی، دل ہی دل میں وہ خوشی خوشی اپنی کارستانی کا خیال کر رہی ہوگی۔ کون تھا یہ جوگی؛ دل پوچھتا ہے۔ کہیں یہ بات تو نہ تھی کہ ہماری کہانی کا شہزادہ سات سمنہ پار کی شہزادی کی تلاش میں مایوس ہو کر جوگی بن گیا تھا، اور پھر ایک دن چرخہ کی گونج سن کر دیپاتی شہزادی کے پاس آ پہنچا تھا؛ کسی ایسے ہی موقع پر بھرتی ہری نے کہا تھا "عورت کے دل کو جو کونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ آئینہ میں عکس کو باندھنا۔ عورت کے راستے دشوار گزار ہوتے ہیں، اونچے پہاڑوں کی پگڈنڈیوں کی طرح۔ اُس کے جذبات اس کے قطروں کے ہم پلہ ہیں، جو صبح کے وقت پھول پتوں پر ٹپکتے نظر آتے ہیں۔ عورت کی غلط فہمیاں اُس کے ساتھ اُسی طرح چھٹی رہتی ہیں، جیسے انگوڑ کی بیل پر زہریلی بوٹی؛" جوگی کے خون میں ایک طوفان سا لہریں مارتے لگتا ہے۔ وہ کہہ اُٹھتا ہے، عورت سچ مچ "مایا" ہے۔ اور چرخہ کائناتنے والی کا گیت جاری رہتا ہے:

”ہر چرخے دے گیرے

ہنترانوں یاد کراں!“

— ’چرخے کے ہر چکر کے ساتھ میں اپنے دوست کو یاد کیا کرتی ہوں!

جوگی دُور سے پسُندر گیت سنتا ہے اور سوچتا ہے، عجب دل لگی ہے

کہ عشق کے نغمے گانے والی دوشیزہ میری طرف دیکھتی تک نہیں! تو پھر

وہ کس دوست کو یاد کر رہی ہے؟

جوگی اپنی راہ لیتا ہے۔ عورت کے گیت جاری رہتے ہیں:

”جند تیرے حوالے کیتی

جند دیاں وٹ پُرنیاں!“

— ’اپنی زندگی میں نے تیرے حوالے کر دی ہے۔ میری اس

زندگی (کو رونی سمجھ لے اور کا تنے کے لئے اس) کے گالے بنالے!‘

عورت کا ایسا رہی سچ مچ اُس کی محبت کی جان ہے:

”تند تیریاں عمال دے پاواں

چرخہ میں آپنا کتاں!“

— ’میں تیرے غموں کے تار نکالتی ہوں، حالانکہ موت میں اپنے چرخے

پر کات رہی ہوں!‘

عورت اپنے محبوب کا غم نہیں برداشت کر سکتی۔ وہ چرخہ کا تسی جاتی ہے

اور اُس کے ہجر میں آنسو بہاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل کے چرخہ پر غم و ہجر کی روئی نکالت رہی ہے۔
 پہاڑ کے قدموں سے سڑا کر اپنا بہاؤ بدلتی ندی کی طرح پھٹو گاتے گاتے
 اپنے نمنوں کا رخ بدلتی رہتی ہے۔ ٹھنکنی لڑکی کا گیت دن میں چار پانچ بار
 تو ضرور ہی گالیتی ہوگی :

”مدری زن داکي صلاحنا“

جیوں چرخے دانتا

نُردمی پھردی نظر نہ آوے

بیڑھا ستم سنا“

ٹھنکنی عورت کی کیا تعریف کی جائے، چرخہ کے پائے سی تو ہے
 وہ چلتی پھرتی وہ نظر نہیں آتی، آنگن سونا معلوم ہوتا ہے۔
 کسان اور اُس کی بیوی صدیوں سے خوابوں نے جعل گیت گائے آ رہے
 ہیں۔ ہر وہ شخص جو ہل اور چرخہ کی شاعری سُنانا چاہتا ہے، جو پڑانے تمدن
 کے اچھوٹے بول سُنانا چاہتا ہے، ایک بار ہمارے گاؤں میں آ جائے۔
 صدیوں سے کسان عورت کی آواز کو سختی چلی آ رہی ہے :
 ”میرا لے چل چرخہ بولتھے“

وے جھٹھے تیرے ہل و گسے !“

— میرا چرخہ وہاں لے چل جہاں تیرا ہل چل رہا ہے۔
 آج بھی کسان عورت کے پاس بٹھوس حقیقت کو الفاظ میں منتقل کر دینے
 والی یہ قوت موجود ہے، صرف تفریح میں پریم کا رنگ نکھرتا ہو، یہ بات نہیں۔
 خاوند ہل چلا تا رہے، اور کھیت کے کنائے جھونپڑی کے دروازے پر بیوی
 چرخہ کا تا کرے، اور اس طرح اُس کی آنکھیں محبوب کو بیچ کے لئے کھیت تیار
 کرنے دیکھتی رہیں۔ زندگی کی یہ تصویر ایک نئی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ بھلے
 ہی گرم ہوائیں چلیں، سورج آگ برسائے، کسان کی خوش نصیبی میں کسے شک
 ہو سکتا ہے جبکہ اُس کا بہترین سرمایہ — بیوی کا ٹکھڑا — چار قدم پر موجود ہے۔
 چرخہ اور ہل دیہاتی زندگی کے دوز بردست پہنچے ہیں۔ جب آدم ہل
 چلایا کرتا تھا اور خواتین چرخہ کا تتی تھیں، تب آج کا "جنٹلمین" کہاں بٹھا؟ پڑانے
 انگریزی گیت میں چرخہ اور ہل کی اہمیت تہذیب کے بنیادی معیار پر روشنی
 ڈال رہی ہے۔

خواتین کی بیٹی آج بھی چرخہ کا تتی ہے۔ اور چرخہ کے گیت، جنہیں گاتے
 چھٹو کبھی ٹھکتی نہیں، ایک ایسا بے نظیر مقامی رنگ لئے ہوئے ہیں جو طوٹ
 کے پیچھے چلنے والی ترقی پسند شاعری کی جان ہوا کرتا ہے۔

۱ "When Adam delved and Eve span
 Where was then a gentleman?"

خاص کردہ چرخہ جو ماں سے ملا ہو، جُول جُول پرانا ہوتا جاتا ہے اُس گئی آہستہ
بڑھتی جاتی ہے۔ یقین نہ ہو تو سسرال میں چرخہ کا تتی دُھن کا گیت سن لیجئے
چھلو کی زبانی:

”ماں میری نے چرخہ دیتا
دیج سیو نے دیاں میخاں!
نی مائے! تینوں یاد کراں!
جد چرخے ول دیکھاں!!“

— میری ماں نے مجھے یہ چرخہ دیا تھا، اس میں سونے کی میخیں لگی ہوئی
ہیں۔ اماں! میں تجھے یاد کیا کرتی ہوں، جب بھی مجھے یہ چرخہ نظر آ جاتا ہے!
جب چھلو کی شادی ہو جائے گی تو وہ شاید اس گیت کو اپنی سوانحی
کا ایک ورق بنالے گی۔ یہ ہے مادری محبت کی یاد، جس کے زیر اثر چرخہ میں
لگی بروئی پیتل کی میخیں سونے کی معلوم ہوتی ہیں۔

غریبوں کے چرخے کیکر کی لکڑی سے تیار ہوتے ہیں۔ جس کا باپ یا
خاندان امیر ہو وہ شیشم کا چرخہ پا کر پھولی نہیں سماتی۔ چرخہ خوبصورت نہ ہو تو
کاتنے کامزاکر کرنا ہوتا ہے۔

”چرخہ میرا رانگلا
تند کڈھاں دریاؤ!“

— 'میرا چہرہ رنگین ہے اور میں دریا بہتا لبا (تار نکالتی ہوں)!' خوش قسمت دُھن کا یہ گیت گاتے گاتے تنجن کی سہیلیاں فخر سے اپنا سر اُونچا کر لیتی ہیں۔ دیہات کی جدت پسند شاعری کھیتوں اور تنجنوں میں پٹی ہے، اس نے دریاؤں کی روانی دیکھی ہے۔

۲

چھٹو چہرہ کات رہی ہے۔ اُس کے چہرہ کی رفتار کبھی سُست نہیں پڑتی روز بروز، لمحہ بہ لمحہ اُس میں سمجھ بوجھ پیدا ہوتی گئی ہے۔ مگر آج بھی اُسے بچپن کے وہ دن بھولے نہیں جب وہ اپنی ماں کے چہرہ کے سامنے بیٹھ کر ماں کی طرح باریک تار نکالنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ ماں کہتی "نا چھٹو، ابھی تو بچی ہے۔ ضد مت کر بیٹی۔ اُٹھ کھڑی ہو یہاں سے۔ دیکھنا نکالمت خراب کر دینا۔ چھٹو نہ مانتی ماں گھورتی، اور پھر چھٹو رونے لگتی۔ میں نے خود اُسے روتے دیکھا تھا، اُس کے اصرار پر اُس کی ماں کہہ رہی تھی "میں تجھے ایک چرخ منگوا دوں گی۔" میں رنگین چرخ لوں گی "چھٹو کہہ رہی تھی۔" اچھا رنگین ہی سی۔۔۔ ماں کے مُنہ سے یہ الفاظ کہلا کر کہیں چھٹو چپ ہوئی تھی آج وہ بچپن کے دن بہت تیجھے رہ گئے ہیں۔

چھٹو کا گھر دُور نہیں۔ ہماری اس گلی میں وہ سامنے کا گھر، جہاں چھٹو پیدا ہوئی، جہاں اُس نے چہرہ کا تنا سیکھا، جہاں چہرہ کے گیت اُس کی

زبان پر چڑھے اُس کی شاوی کے بعد بالکل اُداس ہو جائے گا، اور وہ وقت اب بہت دُور نہیں۔ تنجن تو اُس کی غیر حاضری میں بھی لگا کریں گے، مگر چرخہ کا تنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر چھٹو کی ماں ہمیشہ اپنی بیٹی کی حُسدانی محسوس کیا کرے گی۔

چرخہ کا تتی چھٹو کا اُچھل اُس کے کندھوں سے سرک کر ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ وہ تنجن کی رانی ہے۔ تنجن تو میں نے اپنے ہی گاؤں میں سینکڑوں دیکھے ہیں مگر جو تنجن چھٹو کے آنگن میں جمع ہوتا ہے، اُس کی رنگینی اور رونق کا کیا مقابلہ! اس تنجن کی خاص خوبی یہی ہے کہ یہاں کبھی گہرے گہرے کی طرح خاموشی نہیں چھائی رہتی۔ حق تو یہ ہے کہ چھٹو سے بڑھ کر گھانے والی لڑکی ہمارے گاؤں میں آسانی سے نہ مل سکے گی۔

”جب بیٹا پیدا ہوتا ہے، گھر کی دیواریں کانپ اُٹھتی ہیں، کہتی ہیں، ”نیا بر خور دار آ رہا ہے، کون جانے وہ ہماری خوبصورتی میں اضافہ کرے گا یا ہمیں اُکھاڑ پھینکے گا!“۔ پنجاب کے کسان یہ بات بڑے شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ لڑکی کی پیدائش سے متعلق ایسی کوئی بات میرے سننے میں نہیں آئی۔ لڑکی سے والدین کے گھر کی دیواریں بھلا کیوں ڈرینگی! ایک دن وہ اس گھر کو خیر باد کہہ کر سُسرال کی راہ لے گی۔

ایک ایک کر کے تنجن میں جمع ہونے والی سب کی سب کنواری لڑکیاں

بیاہی جائیں گی۔ اُن کی جگہ دُھنوں کو ملتی جائے گی۔ چھٹو کا کوئی بھائی
ہوتا تو اُس کی ماں اسی اُمید پر خوشی مناسکتی تھی کہ ایک دِن چھٹو کی غیر حاضری
سے پیدا ہونے والی اُداسی اُس کے بیٹے کی پہچان آنے پر رفع ہو جائے گی۔
بچپن کی سہیلیاں جو ایک ساتھ تنجن میں جمع ہوتی رہیں، بیاہ کے بعد بھی
میکے آتی رہیں گی، لیکن سب کی سب تو پھر اکٹھی نہیں ہو سکتیں:

”پُورہ بیڑی دا تنجن دیاں کڑیاں،

سب نال ہون کھیاں!“

— کشتی میں ایک ساتھ پار ہونے والے مسافر اور تنجن میں ایک ساتھ
چرخہ کا تنے والی لڑکیاں، بڑی مشکل سے اکٹھی ہوتی ہیں!
چھٹو اُس دُھن کا گیت دُہرایا کرتی ہے جس نے سُسُرا ل کے راستے
میں کہا تھا:

”لگیاں تنجن دیاں“

میزوں یاد گدڑی وچ آئیاں!

— تنجن میں پیدا ہوئے پیار مجھے اب اس بیل گاڑی میں بیٹھے
یاد آ رہے ہیں!

اور اُسے کسان دُھن کا وہ یاس انگیز گیت بھی یاد ہے جس میں
اُس نے ایک بار میکے میں لوٹ کر گھر کے چھوٹے میں کھڑے بڑے کے

درخت سے پوچھا تھا کہ اُس کی چھاؤں میں جمع ہونے والے تنجن کہاں چلے گئے!
اُور بُوڑھے بڑے، جس نے اپنے بچے ہزاروں تنجن دیکھے تھے، جواب
دیا تھا :

”کچھ سوہرے کچھ پیو کرے

کچھ لتے راہ پئے !

بھریاں مڑا حیاں رہ گئیاں

پیالے کول پئے !!

— ”کچھ لڑکیاں سُسرال چلی گئی ہیں، کچھ ابھی یہاں اپنے میکے ہی
میں ہیں، اور کچھ (موت کے) لمبے راستے پر چلی گئی ہیں۔ بھری ہوئی صُریا
رہ گئیں، ہائے! پیالے بھی اُن کے پاس پڑے رہ گئے!“

زندگی اور موت کے دورا ہے پر پیدا ہونے والے گیتوں میں خود بخود
مُوفیانہ رنگ آجاتا ہے۔ چاہئے تو یہ کہ تنجن کی ہر لڑکی ”موت کے لمبے اسٹے“
پر گامزن ہوتے وقت شاعر کے الفاظ میں یہ کہہ سکے ”اے میری دُنیا!
اجنبی کی طرح میں تیرے کنارے پر آئی، مہمان کی طرح تیرے گھر میں
رہی، اور اب میں تجھے ایک سیلی کی طرح چھوڑ رہی ہوں۔“

کئی سال کی خانہ بدوشی کے بعد حال ہی میں جب میں اپنے گاؤں

پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ چھٹو اب وہاں نہیں ہے۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی ہے۔ اور یہ جان کر میں بہت حیران ہوا کہ ہماری گلی کی سب کی سب عورتیں چھٹو کی غیر حاضری میں بھی بدستور خوشی خوشی تنجن میں جمع ہوا کرتی ہیں، اور تو اور، چھٹو کی ماں بھی اتنی اُداس نہیں جتنی میرے اندازہ کے مطابق وہ ہونی چاہئے تھی۔

گھر کے کھلے آنگن میں چرخہ کا تنے والیوں کی بزمِ سخن روز بروز ہمارا من موہنے کے لئے جھی رہتی ہے۔ بیسیوں لڑکیاں بیاہ کے بعد اس تنجن سے الگ ہو جاتی ہیں۔ بیسیوں دلہنیں اُن کی جگہ خانہ پڑی کے لئے آ حاضر ہوتی ہیں۔ تنجن قائم رہتا ہے اور گھر کا آنگن سمندر کے ساحل کی طرح ہوتا ہے جہاں چمکتی ریتِ صدقِ دل سے نئی نئی لہروں کے تظاہر میں پڑی رہتی ہے۔ چرخہ کا تنے والی ہر بہو بیٹی اکابر لہری تو ہوتی ہے چھٹو وہاں اپنی سسرال میں کیا سوچ رہی ہوگی؟

اس پہاڑ کی وہ گونج اُس پردیس میں کیا کبھی بچپن کی سہیلیوں کو یاد نہ کرتی ہوگی؟ کبھی وہ اپنی ماں کے آنگن میں کوئل کی طرح گول گول کر گایا کرتی تھی:

”کوئچے پہاڑ دیئے،

کدے پاوٹناں ول پھیرا!“

۱۔ پہاڑ کی کوچ ! کبھی تو اپنے وطن کی طرف بھی آئے۔

ہائے ! آج وہ خود کوچ بن کر اپنے میکے سے اڑ گئی !

ہاں ! تو چھٹو کی غیر حاضری میں بھی چرخوں کی گھوٹوں گھوٹوں قائم ہے اترتے کے وقت چاند بدستور ہمارے گاؤں کے مکانوں پر اپنا آشیرادہ بھیجا ہے۔ ستارے بھی ہمارے گھروں کی طرف پہلی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حتیٰ تو یہ ہے کہ قدرت کے نظام میں گاؤں کی کسی ایک لڑکی کے آنے جانے سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ مگر ہائے ! چھٹو چلی گئی اور میرا دل اُداس ہے۔ چاند کیوں اُداس نہیں؟ ستارے میری اُداسی میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ ٹھیک چاند اور ستارے تو اُسے اُس کی سُسراں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

چھٹو کے آنگن میں اُس سے کچھ گیت سن لکھ چکنے کے بعد میں نے جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ بسنت خچی کا دن تھا۔ سرسوں کے کھیت کی سی طراوت اُس کے بھاش چہرے سے ہنسی پڑتی تھی۔ چھٹو اب سیانی ہو رہی ہے ! میں نے کہا تھا۔ سرسوں کا پھول جسے میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، کہہ رہا تھا "سیانی ہی نہیں ہو رہی" چھٹو نکھر بھی رہی ہے ! "چھٹو کی ماں مسکرا رہی تھی، اور خود سن چھٹو بھی جس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔

میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ چٹو کی یاد میں میں اتنا اُداس ہو جاؤں گا۔
 آج وہ مجھے نظر آجائے تو میں شاعر کے الفاظ میں اُس سے کہہ دوں "تو مسکرا
 دی" اور تُو نے میرے ساتھ کوئی بات چیت نہ کی، اور میں نے محسوس کیا
 کہ مجھے ایک مدت سے تیری مسکراہٹ کا انتظار تھا!"

اپنی سسُراں میں بھی وہ تنجن کی رانی ثابت ہوئی ہوگی۔ شاعری کے
 وہ سب جواہر پارے جو اُن گزرت نسلوں کے بعد سینہ بہ سینہ اُس تک آ
 پہنچے ہیں، بدستور اُس کی زبان پر ہوں گے، اور مجھے یقین ہے کہ اُس کا
 خاوند اُس کے لئے ایسا ہی ثابت ہوا ہوگا جیسا ہماری کہانی کا وہ شہزادہ
 جوسات سمندر پار کے نامعلوم جزیرہ کی شہزادی سے شادی کرنے کی دُھن
 میں دلیوانہ ہو گیا تھا۔

لاپتی

”اے حبیبہ! اپنی اصلیت پیار میں کھوج، آئینہ کی چالوسی میں نہیں! شہر ٹیگور نے کہیں لکھا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی آواز نہیں۔ سینہ بہ سینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، سینکڑوں نسلوں سے یہ آواز عورت تک پہنچتی رہی ہے۔ خور اپنے خاوند کی آواز میں بھی اُس نے اکثر آئینہ کی چالوسی پائی ہے۔ عورت کو سطحی انداز سے دیکھنا کتنا آسان ہے۔ بہت کم ہیں جو اُس کا چہرہ نہیں دیکھتے، اول دیکھتے ہیں۔“

الاؤ کے سُرخ اور سنہری شعلے اُپر آسمان کی طرف منہ کئے ہوئے ہیں،

اور جاڑے کی رات آنکھیں کھولے پڑی ہے۔ سب کے سب چہارا جن کی رگیں اور پٹھے دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد الاؤ کی گرمی میں نئی زندگی محسوس کر رہے ہیں، مدھ بھرے سنگیت کی بات جوہ رہے ہیں۔

یورپی کے دیہات میں جنہوں نے کبھی چاروں کی محفلیں دیکھی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اُن کے گیتوں کے اثر تلے انگڑائی لے رہی رات بھی کچھ گھنٹوں کے لئے نیند کو دور رہی سے سلام کہہ دیتی ہے۔ جب ڈھولک بجنے لگتی ہے ساری فضا اس کی بھڑکن پر ناچ اُٹھتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہاں کوئی غربت باقی رہی ہے، نہ کوئی غلاظت، سماج کے یہ اچھوت جن کی آنکھوں میں بے بسی اپنی درد بھری کہانی لکھتی رہتی ہے۔ الاؤ پر جمی اس محفل میں جیسے دھرتی ماتا کا آشیر واد پالبتے ہیں۔ وہ آشیر واد جنہیں شاید دن کے وقت جب، اونچی ذاتوں کے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ نہ دے سکے!

”گیت کو چلنے دو۔“

”کونسا گیت؟“

”وہی لاچی والا۔“

یہ لاچی کیا بلا ہے؟ میں سوچ رہا ہوں۔ گیت شروع ہونے میں شاید ابھی کچھ دیر ہے۔ نارنجی لپٹیں اُپر اٹھ رہی ہیں۔ شاید وہ بھی لاچی سے

واقعہ ہونا چاہتی ہیں۔ کیا لاپچی کوئی شہزادی تھی؟ کیا اُس کا ٹکھڑا الاؤ کے
سُہری شعلوں سے بازی لے سکتا تھا؟

”مہوآ تو آج ہے نہیں۔“

”مہوآ کے بغیر سنگیت کا کیا رس؟“

”تو لاپچی کا گیت کیا صرف مہوآ ہی جانتا ہے؟“

ساری محفل میں شور مچ گیا۔ ڈھولک پھر بجنے لگی۔ الاؤ کی سُہری روشنی
میں کالے کلوٹے آدمی بھی کتنے بچلے دکھائی دیتے ہیں۔ گورے چٹے آدمی
اس محفل میں کھوجنا نرمی غلطی ہوگی۔ مگر میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے
کہ حُسن کی دیوی ان دھرتی کے بیٹوں کو اپنے رتن نہیں بخشی۔

کتنے خوش ہیں یہ لوگ، جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے سب کے سب
سُنے سچ ہو گئے ہوں۔ کتنا مذاق، کتنی چٹکیاں، کتنے قہقہے، کتنے لطیفے۔
یہ سب اس الاؤ کے شعنے ہیں، جو اُن کی دلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ہماری
کہانی کے ساتوں کے ساتوں شہزادے ان چاروں کی بے فکری پر
رشک کر سکتے ہیں۔

”لاچی کا گیت تو لچھمن کی بھابی جانتی ہے۔“

”تو لچھمن کی بھابی ہی گادے۔“

ساری محفل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور خود لچھمن کی بھابی بھی ہنس رہی

ہے۔ سر پر پورنماشی کا چاند چمک رہا ہے۔ ستارے بھی دھرتی والوں کی اس
محل کی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
پچھن کی بھابی کوئل کی طرح کوک رہی ہے:

برہے برسواک پچیا سُریا رے نا

پچیا کھر کی مٹھی لینی بیڑیا رے نا

— حسینہ لاچی بارہ برس کی ہے

کھڑکی میں بیٹھ کر لاچی ہوا کھا رہی ہے!

گھوڑوا چر دھل آویں ایک راجپوتوا رے نا

راما پڑی گئی لیں لاچی یہ نظریا رے نا

— گھوڑے پر چڑھ کر ایک راجپوت آنکلا۔

لاچی پر اُس کی نظر پڑ گئی!

گھوڑوات باندھے راجہ کدے کی ڈاریا رے نا

راجہ چلی گئی لیں گُٹنی مھلیا رے نا

— راجہ نے اپنا گھوڑا کدے کی شاخ سے باندھ دیا

اور راجہ گُٹنی کے محل کو چلا گیا!

دیویوں میں گُٹنی رے پانچ موہریا رے نا

گُٹنی پچیا مھوڑی لئی آووں رے نا

اے کٹنی! میں تجھے پانچ اشرفیاں دوں گا۔
 ارسی او کٹنی! لاپچی کو بہکا کر لے آؤ!
 کیسے ک لچیا ک بھوروں راجپوتوں رے نا
 راجہ لچیا سووے سوامی کو روا رے نا
 اے اور راجپوت! لاپچی کو کیسے بہکاؤں؟
 اور راجہ! لاپچی تو اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے!
 ہتھو لے او کٹنی چہرہ ہی گو انٹھیا رے نا
 کٹنی اگیا اوڈھر لچیا بھورو رے نا
 اے ہاتھ میں اُپے لے لو، او کٹنی!
 او کٹنی! آگ لینے کے بہانے لاپچی کو بہکا لاؤ۔
 بھیتراٹو کی باہر لچیا رے نا
 لچیا سب سکھی جاتھیں نہونے رے نا
 اے لاپچی اندر ہو یا باہر؟
 ارسی او لاپچی! سب سکھیاں نہانے جارہی ہیں۔
 اتنی سچن سنی لچیا لونگیا رے نا
 ساسو جاتی باٹی سگرے نہونے رے نا
 اے اتنی بات سن کر وہ لونگ سی لاپچی (راس سے بولی)

میں تالاب پر نہانے جا رہی ہوں۔
 سگرے ک پنا ہواری لاگے پترینگا رے نا
 ہواری گھر ہیں کرو اسنوارے نا
 — 'تالاب کا پانی تو چھج جاتا ہے' اور سی پتلے جسم والی!
 ارسی او دھن! گھر پر ہی نہالو!
 گڈو اسی کھیت موری لہوری ننڈیا رے نا
 ننڈی جاٹ بائی سگرے نہونے رے نا
 — ارسی او گڑیا کھیلتی میری چھوٹی ننڈا!
 اوننڈ! میں تالاب پر نہانے جا رہی ہوں!
 بھوجی بابا مورا سگرا کھودے ہیں رے نا
 بھوجی بھیا مورا گھٹوا بندھے ہیں رے نا
 — ارسی او بھابی! میرا باپ نیا تالاب کھدوائے گا۔
 او بھابی! میرا بھائی (اس تالاب کا) گھاٹ تیار کرائے گا۔
 تب موری بھوجی توں سگرے نہا او رے نا
 بھوجی گھر ہیں کرو اسنوارے نا
 — تب اے میری بھابی! تم اس تالاب میں نہانا،
 او بھابی! آج تو گھر میں ہی نہالو!

کیڑھوک کہنوا لاچی من ہی نہ آوے رے نا
 لاچی کھولی لپیں رٹولی پیر دیا رے نا
 — کسی کی بھی بات لاچی کے من نہ لگی
 لاچی نے اپنی لال رنگ کی پٹاری کھول لی؛
 اوڑھی پہری لچیا آئی اوسروا رے نا
 ساسو جاتی باٹیوں سگرے نہنوا رے نا
 — پین اوڑھ کر لاچی برآمدے میں آئی

اوساس جی! میں تالاب پر نہانے جا رہی ہوں۔
 جہاں جہاں لچیا کرے بیٹھکوا رے نا
 نہاں نہاں راجہ گھوڑ ٹھکاویں رے نا
 — رراستہ میں، جہاں جہاں لاچی سستانے لگتی ہے۔
 وہاں وہاں راجہ اپنا گھوڑا بٹھرا لیتا ہے؛

بڈو کیا لچیا مرنی او نہ پائے رے نا
 راجہ اتنے میں چُنری اٹھائیں رے نا
 — لاچی نے ابھی ایک بھی بکلی نہیں ماری،
 راجہ اس کی چُنری اٹھانے لگا؛
 دیوں نہ راجہ کا ہیں ہماری چُنریا رے نا

راجہ مور مانسو کھائیں مچھریا رے نا
 — اور راجہ! تم میری چنری کیوں نہیں دیتے؟
 راجہ! مچھلیاں میرا س لوج نہ ہی ہیں!
 جو ہم دیئی لچیا تو ہری چنریا رے نا
 لچیا ہمرے گوہنوا چلی چالو رے نا
 — لاچی! اگر میں تمہاری چنری دے دوں،
 تو اری اولاچی! میرے گھر میں چلی چلو نا!
 جو ہم چلی راجہ تو ہرے گوہنوا رے نا
 راجہ تو ہیں لے سندر مود بیا ہوا رے نا
 — راجہ! تمہارے ساتھ میں کیوں چلوں گی؟
 تم سے کہیں زیادہ حسین ہے میرا خاوند!
 جے کے مر مر کرے جتوا رے نا
 جے کئے اینٹریا برن پر دنیا رے نا
 — (چلتے وقت) جس کی جوتی مر مر کرتی ہے،
 اور جس کی ایڑی کی طرح لال کنارے دائرہ ہوتی ہے،
 یقیناً سنت راجہ مونڈہ بچو کائے فی رے نا
 لچیا تو ہیں لے سندر می موری بیا بیا رے نا

— اتنی بات سن کر راجہ کا چہرہ اتر گیا۔

ارمی اور لالچی اہم سے کہیں حسین تو میری بیوی ہے۔

جے کے بھہر بھہر کرئی بروا رے نا

جے کے مڑی برن کری ہنیاں رے نا

— جس کے بال چمکتے ہیں،

جس کی کمرانگوٹھی کی طرح گول ہے۔

ی
گیت ختم ہو گیا بے ساری محفل شاداش کی صدا بلند کر رہی ہے۔ لالچی کی وفات
کی یہ تصویر جو مجھے اس میں دیکھنے کو مل گئی ہے، مجھ پر وجدانی کیفیت پیدا کرنے
کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ لالچی بھئی کون؟ کیا وہ ایک چمار عورت تھی؟ لچمن کی
بھابی سی جس نے یہ گیت بڑی مزے دار لے میں گاٹنا یا سب سے لالچی نے
راجہ کی جنسی خواہش سن کر اُسے جلی کٹی باتیں سننے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔
بلکہ اُس نے اُسے یہ بتا کر کہ اُس کا خاوند اُس سے کہیں حسین ہے، اپنا
جذبہ اُس پر ظاہر کر دیا۔ کٹنی نے ٹھیک ہی تو بتلایا تھا کہ لالچی اپنے خاوند
کی گود میں سوتی ہے یعنی اُس پر وہ کسی غیر مرد کو ترجیح دے گی۔ لالچی
گاؤں کی بیٹی ہے اور خاوند کے جوتے کی مرمر آواز پر اور لال کٹنے داروئی
پر سوجان سے قربان ہو رہی ہے۔ اتنی دُور اُس کا پیچھا کرنے کے بعد چہ
بھی بہت مایوس ہوا۔ وہ بہت شرمندہ بھی ہوا، من ہی من میں اس شرمندگی

کی حالت میں اُسے اپنی رانی کی یاد آئی جو لاپچی سے کہیں زیادہ حسین تھی۔

”دو لڑوں کا دھرم بچ گیا۔“

’جی ہاں، لاپچی اور راجہ دو لڑوں کا دھرم بچ گیا۔‘

’مہوآ کی بیوی کو لاپچی کا ایک دوسرا گیت یاد ہے۔‘

’چلنے دو وہ گیت بھی۔‘

’ہاں، چلنے دو۔‘

’ڈھولک پھر بجنے لگی ہے۔‘

’مہوآ کی بیوی! گاؤنا پھر۔‘

ساری محفل ہنس پڑی ہے۔ ڈھولک اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ الاؤ کے

شعلے بہت اونچے اٹھنے لگے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں — مہوآ کی بیوی!

گاؤنا پھر!

اور مہوآ کی بیوی نے اپنے پیپھڑوں کی پوری طاقت سے گیت شروع

کیا ہے، وہ اتنے زور سے گارہی ہے کہ گاؤں بھر کے آدمی اُس کی آواز

سُن سکیں۔

اپنی کھڑکیا پچھا جا رہے لائیں کیا ہو نا

پچھا پڑی گیلے جے ہنگھ سخریا ہو نا

— اپنی کھڑکی پر بیٹھ کر لاپچی اپنے بال جھاڑ رہی ہے۔ لاپچی پر جے ہنگھ

کی نظر پڑ گئی۔

اپنی کھڑکیاں پچیا کرے دتو! اپنا ہونا
پچیا پڑی گیلے جے سنگھ چھٹکوا ہونا
— لاچی اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر داتن کر رہی ہے۔ لاچی (کی داتن کے)
چھینٹے جے سنگھ پڑ گئے۔

اوتے چلو اور تے چلو جے سنگھ رجوا ہونا
جے سنگھ پڑی جیمیں دتو! چھٹکوا ہونا
— پرے ہٹ جاؤ، پرے ہٹ جاؤ، راجہ جے سنگھ! او جے سنگھ! داتن
کے چھینٹے پڑ جائیں گے۔

اوتو نہ موری لاچی ہمری سچریا ہونا
لاچی مانی ہوئی کے سب سنگھ بلسو ہونا
— لاچی! میری سچ پر آ جاؤ نا۔ اری او لاچی! رانی ہو کر سب منے لوٹو!
انی سنی بول جنی بولہو رجوا جے سنگھ ہونا
راجہ ہم تو دھرم کئے بیٹیا ہونا
— راجہ جے سنگھ! ایسی بات مت بولو۔ اور راجہ! میں تو مہاری
دھرم کی بیٹی ہوں!

اوهواں سے گئی لے جے سنگھ کٹنی محلیا ہونا

بڑھیا لاپچی کے بھورنی موہی آن ہو ہونا
 — وہاں سے چل کر جسے سنگ گٹنی کے محل میں پہنچا (اور بولا) اری بڑھیا!
 لاپچی کو بہکا کر لے آؤ!

لچیات تے رجا سوای جی کے کورواں ہونا
 رجا پچھو لے ہمینہ کے اوتنیا ہونا
 — لاپچی تو اپنے خاندان کی گود میں سوتی ہے۔ اور راجہ! وہ تو چھ ماہ
 کی گرجہ وتی ہے۔

لیہو ن گٹنی رے ڈال بھری سونا ہونا
 گٹنی لاپچی کے بھورانی موہی آن ہو ہونا
 — اری گٹنی! ڈلیا بھر کر سونا لے لے۔ او گٹنی! لاپچی کو بہکا کر لے آؤ!
 ہتھوا کے لے لیں بڑھیا گوئیں مٹھا چیریا ہونا
 بڑھیا گیا بہانے لاپچی کہاں اتی لی ہونا
 — بڑھیا نے ہاتھ میں گوبر کی تھنکی لے لی۔ آگ لینے کے بہانے
 بڑھیا لاپچی کے گھر آئی۔

باہر باڈو کی بھیت رچیا اوتنیا ہونا
 لچیا سب سکھی جا لے تھوا ہونا
 — باہر ہوا اندر، اب گرجہ وتی لاپچی؟ لاپچی! سب سکھیاں گنگہ اشک

کے لئے جارہی ہیں،

برہا برس پر لنگی، ترعقد ہونا
لاچی تہوں چاہو گنگا اسنوں ہونا
— بارہ سال کے بعد یہ تیرتھ کا دن آیا ہے۔ لابی ! تو بھی گنگا شان
کے لئے چل۔

مچیا بیٹھلی تہوں ساو بڑھے بن ہونا
ساو ہم جیو گنگا اسنوا ہونا
— اے مچیا پر بیٹھی ساس امیری بزرگ ! ساس امیں گنگا شان
کے لئے جاؤں گی۔

اتنی بولی جنی بولہو بہوآ ہونا
بہوآ چھو رے مہینہ کے الونتیا ہونا
— بہو ! تو اتنی بات مت کر۔ بہو تو چھ ماہ کی گرہ دتی ہے۔
ایک کو سے گئی لی لابی دنی کو سے گئی لی ہونا
رانا پڑی گئی لے جے سنگھ بھریا ہونا
— ایک کو س گئی لابی دو کو س گئی۔ اور ام ! اس پر جے سنگھ
کی نظر پڑ گئی۔

اُوہاں سے جے سنگھ بھجے ہر کردا ہونا

رانا تا ہی پیچھے گھوڑا اُڑو لے ہو نا
— 'دہاں سے جے سنگھ نے ہرکارا بھیجا رلاچی کو روکنے کے لئے
اور ام! اس کے بعد اُس نے اپنا گھوڑا اوڑایا۔

گھوڑا سے اُتری جے سنگھ لاچی کہاں ائی لے ہو نا
جے سنگھ لپکی دھئی لے داہن بیاں ہو نا
— 'گھوڑے سے اُتر کر جے سنگھ لاچی کے پاس آیا۔ لپک کر جے سنگھ
نے اُس کی بانہہ پکڑ لی۔

چھوڑو چھوڑو جے سنگھ ہمدردا ہو نا
جے سنگھ توہرا سے سُندر مور رجا ہو نا
— 'چھوڑو چھوڑو جے سنگھ! میرا سچل چھوڑو۔ جے سنگھ! میرا راجہ
تم سے کہیں حسین ہے!'

ائی سنی بولی جنی بولو رانی لچیا ہو نا
لاچی چلی چکو مہری سبجیا ہو نا
— 'اولاچی رانی! ایسی بولی مت بولو۔ لاچی! میری سچ پر چلی چلو نا۔
اتنا بچن لاچی سُنبی نہ پکڑی ہو نا
لاچی کا ڈھی کٹریا جیوا لہلی ہو نا
— 'اتنی بات ابھی لاچی نہ سُن پائی تھی۔ لاچی نے کٹار نکال لی اور

اُس نے رجبے سنگھ کو مار ڈالا۔

اُوہاں سے چلی لاجی گھر کے پہنچلی ہو نا

اما ساسو گری آوے بابا موانی ہو نا

— وہاں سے چل کر لاجی گھر پہنچی۔ اور ام اساس کہتی ہے۔ تیرا بابا

مرجائے (تو اب تک کہاں تھی؟)

جنی ساس بابا کھا ہو جنی ساسو بھیا کھا ہو نا

ساسو بیٹیا روکیلاٹ پردا ہو نا

— نہ اے ساس، میرے بابا کو کھاؤ۔ نہ اے ساس، میرے بھائی

کو کھاؤ۔ اداساس راہ میں ڈاکو نے روک لیا تھا۔

گیت ختم ہو گیا الاؤ کی سنہری لپٹوں کی روشنی میں میں مہو آ کی بیوی کی

طرف دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے بیچ میں بڑی شان سے بیٹھی ہے۔ جیسے وہ خود ہی گیت کی لاجی ہو اور رجبے سنگھ کو ابھی ابھی موت کے گھاٹ اتار کر اس گیتوں

کی محفل میں آگئی ہو۔

ڈھولک کی تھرکن بند ہو گئی ہو آگ لگئی ہو۔ سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے ہیں۔

پگھن چہار اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے، رات جاڑے کی انگریزی لکھی ہے۔

میں ہوں خانہ بدوش

بچپن میں میں نے ایک پنجابی گیت سنا تھا :

”مگی دگی پڑے دی وا

اگے اسل ٹرنا نہیں۔

نہیں نہیں وے !

ٹرناں ناں ہینگا بھیرا

پچھتے اسل ٹرنا نہیں۔

نہیں نہیں وے !

وکی پڑے دی وا

تہچتھے آساں مڑنا نہیں !

— چلی، لو پورب کی ہوا چلی۔ ہم آگے نہیں چلیں گے، نہیں، ارے
نہیں، چلنا تو بہت (باقی) ہے ہم واپس نہیں جانیں گے، نہیں، ارے !
نہیں، لو پورب کی ہوا چلی، ہم واپس نہیں جائیں گے !
ان الفاظ کا تعلق میری مادری زبان سے تھا۔ دیہات کی جیتی جاگتی شاعر
کی یہ آواز میرے دل میں بس گئی۔

کھلی آزاد فضاؤں کے لئے میرا دل ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ ہوائیں
مجھے اڑانے لئے پھرتی ہیں۔ یہ ہوائیں مجھے بے حد پسند ہیں اور میں خوش ہوں۔
ہواؤں کے گیت میں نے اکثر سنے ہیں، ہچکلے سال میں نے اپنے
گاؤں میں ایک رُوح پرور آواز والی کسان لڑکی سے ایک ننھا سا ترانہ سنا تھا
”آئی آں میں واین کے“

ہنچ باریاں پنچتھر بوبے کھول کے !

— میں ہوا بن کر، پانچ کھڑکیاں اور پچتر دروازے کھول کر آ نکلی ہوں۔

اسی ہوا سے میرا پیار ہے۔ یہ کھڑکیاں اور دروازے کھول دینے والی
ہوا! یہ چلتی، لگاتی ہوا! یہ مست لڑکھی ہوا! یہ دل میں بسنے والی، سوتے پنچھی کو
جگانے والی ہوا!

میں ہوں خانہ بدوش، ہوا میں مجھے اڑانے لئے پھرتی ہیں۔
 کھلی آواز ہوا میں نہ جانے کتنے گیت، کتنے انسانے لئے آتی ہیں۔
 بھرے دلوں میں بیچ و خم کھاتی، محبوبتی ہزاروں راز افشا کیا کرتی ہیں۔
 ان کی ناچتی لہریں! اور جب میں گاتا ہوں: "لو پورب کی ہوا چلی، ہم وہیں
 نہیں جائیں گے! تو جیسے پوہنی میرے کان میں نئی زندگی کی مبارکباد
 دے جاتی ہے۔"

میری بیوی میرے ہمراہ ہے۔ ایک بیٹی بھی۔

"اس شہر کا کیا نام ہے، پتاجی؟"

"اے بھوڑا، کہتے ہیں، کویتا!"

اسی خانہ بدوشی میں سات سال ہوئے، اڑلیہ اور آندھریش کی سڑ
 پر کویتا پیدا ہوئی تھی۔

میری بیوی کہہ رہی ہے "نئے نئے گاؤں اور شہر دیکھنے کا شوق تو کویتا
 کو اپنے پتاجی سے بھی کہیں زیادہ ہے!"
 "جی ہاں"

ہم تینوں ہنس رہے ہیں، کھلکھلا کر!

"خانہ بدوشوں کی کہانی" ان کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ میرے ساتھ

رہتی ہیں۔ The story of the Gypsies جسے Kenad Barcorici نے لکھا تھا۔

رہی ہیں۔ خانہ بدوش قبیلے جو یورپ میں ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں، کسی زمانہ میں ہندوستان سے وہاں چلے گئے تھے۔ اس کتاب میں ایک گیت دیا گیا ہے جسے یہ لوگ مدت سے گاتے آئے ہیں:

”دُنیا کی دولت اور یہ ملکیت جو تمہارے پاس ہے

تمہیں اپنے پیچھے دبائے رکھتی ہیں۔

اور تمہیں ختم کر ڈالتی ہیں!

محبت چاہئے کھلی آزاد ہو اسی

تازہ اور نئی روح ڈالنے والی!

ہوا کو دیواروں میں بند کر لو یہ گندی ہو جائے گی۔

کھلے خیمے، کھلے دل! ہوا کو چلنے دو!

”جاگ اوسو تے مسافر! اُڑنے کے خواب دیکھنے والا خانہ بدوش ہمیشہ

یہی آواز سنا کرتا ہے” تجھے تو آگے چلنا ہے۔ دیکھ اور مسافر تو چل پڑے

تو بھی چل۔ رات گئی، دن آیا۔ دیکھ کہیں نہ پڑ جائے مایا کا سایا!“ ہواؤں کا

یہ پیغام میں روز سنتا ہوں۔ میں ہوں خانہ بدوش۔

نکما خانہ بدوش نہیں ہوں میں۔

خود کچھ دایک کام میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ گاؤں گاؤں جانا

ہر صوبہ میں لوگوں کے دلوں کا مطالعہ کرنا، اُن کے پُرانے اور نئے گیت

جمع کرنا۔ جب میں اپنے ہم وطن کسانوں کے چہروں پر نظر ڈالتا ہوں، ان کے گیت سُنتا ہوں، ہمالیہ اور گنگا کی ہم عمر مادرِ ہند، جس کے ماتھے پر ابھی جھڑیاں نہیں پڑی ہیں، میرے نیتھے معصوم دل پر ہاتھ رکھتی نظر آتی ہے عالم خیال میں اپنی شہد سی شیریں محبت وہ میری رگ رگ میں بھر دیتی ہے۔

میں گیت جمع کرتا ہوں۔ عوام کے گیت نسل در نسل چلے آئے والے گیت۔ کھلے، شگفتہ، سُکھی جو بن کے گیت، ایندے بوجھل حُن کے خواب، پریم کے زانے، پگھٹ کے گیت اکھیتوں کے گیت، زندگی کی ہر لہر کے گیت، دکھ اور غریبی کے گیت۔ ہندوستان کی آپ بیتی ان گیتوں میں موجود ہے۔

۲

میں ستاروں کی طرف دیکھا کرتا ہوں۔

جھلملاتے ستارے مستی میں ناچنے بہشت کے چراغ ہی تو ہیں، چمکوا چمکنا ہی زندگی ہے، دیکھو ہم ہزاروں صدیوں سے چمکتے آرہے ہیں۔ صدیوں سے ہم آدمی کو چمکنے کے لئے کہتے آرہے ہیں، دور کے تارے خاموشی سے اپنی پُرانی آواز میرے کان میں ڈال جاتے ہیں۔

نیگور نے کہیں لکھا ہے "اے سڑک کنارے کی گھاس کی پتیوں والیوں نہ ہونا۔ ستاروں کی طرف دیکھو، پھر ایک دن ستارے پھول بن کر تمہارے

اندر سے کھل پڑیں گے۔“

کسان ہمیشہ سے ستاروں کی طرف دیکھتا آیا ہے۔
لاولپنڈی کے پاس ایک گاؤں میں، میں نے ایک گیت سنا تھا:
”باغے وچ آیا کرو!“

سوہنے موہنے ناریاں دے
دو گیت سنایا کرو!“

— باغ میں آیا کرو (پیارے) ! خوبصورت اور دل موہنے والے
ستاروں کے دو گیت سنایا کرو (پیارے)۔

ترجمہ میں وہ خوبی نہیں پیدا کی جاسکتی جس سے دیہاتی موسیقی کا جادو
ایک ایک لفظ میں جذبات کی تصویر کو زندہ کر دیتا ہے۔

گاؤں کی لڑکی بھی ستاروں کے گیت سننے کے لئے بے قرار ہے۔
نینوں میں کاجل لگا کر وہ جب چاند کی طرف دیکھتی ہے تو اسے بھی اُس
کے سامنے ہوتے ہیں۔

جب آسمان پر کھٹیاں نظر آتی ہیں، آدھی رات بیت چکی ہوتی ہے
کسان کی بیٹی اپنے گیت میں محبوب کو خط لکھنے کا خیال پیش کرتی ہے:
”آدھی راتیں چڑھن کھتیاں،“

لہ پر وین یا ژیا ستارے۔

سجی دل میں لکھیاں چھپیاں !

لکھیاں بندھیاں یوں پٹھیاں

خدا جانے کہ مرگیاں !!

— آدھی رات کے وقت لکھتیاں چڑھتی ہیں، اپنے محبوب کو
میں خط لکھتی ہوں ! سیدھی بات لکھتی ہوں۔ (نتیجہ) اُلٹا ہوتا ہے، خدا جانتا
ہے کہ میں مڑکھپ چکی ہوں !!

یہ گیت بھی پنجاب کا ہے۔ گاؤں کی لڑکی ناخواندہ ہونے پر بھی محبوب
کو خط لکھنے کا تصور اپنے گیت میں کر سکتی ہے۔ خط میں وہ کیا لکھتی ہوگی؟
”لکھتیاں“ کی تصویر میں اپنی محبت سے ملتی جلتی ایک چمک دیکھ لی ہے
شاید اُس نے۔ اُسی کا پیغام وہ اپنے محبوب کو بھیج رہی ہوگی، اٹھیک
ہے محبت کی مادری زبان ”لکھتیاں“ کی خاموش زبان سے پرے تو نہ
ہوگی ! مگر اُس کی لکھی بات کا اُلٹا نتیجہ کیوں نکلتا ہے؟ پھر ایک دن،
جب محبوب لوٹتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ تارے اسے سلام کر رہے
ہیں۔ پنجاب کے ایک دوسرے گیت میں یہ تصویر موجود ہے:

”چاندی سچی تیری گھوڑی ستجنا !

سیو نے دی لگام !

جتنیں راہیں تولں آیا ستجنا !

تارے کرن سلام!

— چاندی سے آراستہ تیری گھوڑی ہے، اوساجن! سونے کی لگام ہے۔ جن راستوں سے ہو کر تو آیا ہے، اوساجن! (وہاں ستاروں نے تجھے سلام کہا!)

ایک ایسا بھی ستارہ ہے جس کا راستہ آدمی بہ آسانی نہیں سمجھ سکتا۔ پنجاب میں اسے "بودی والا تارا" کہتے ہیں۔ ابھی امرتسر سے ایک دوست کا خط آیا ہے۔ اس میں مجھے "بودی والا تارہ" کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ لکھا ہے: دیر سے انتظار میں ہوں۔ آؤ تو اپنی نظلیں سناؤں۔ دنیا میں ایک دم تاریکی ہونے سے پیشتر ہی لوٹ آؤ تو بہتر ہو۔ تاریکی ہو گئی تو باتیں کرتے کرتے ہم ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھ پائیں گے۔ ارے بھئی! تم تو بڑے بودی والا تارا ہو۔ تمہارے راستے کی خبر پانا آسان نہیں۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا ہے: "میں خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے 'تارا' سمجھتے ہو صبر کرو۔ ایک دن میں چاندی سے آراستہ گھوڑی پر اس کی سونے کی لگام ہاتھ میں لئے امرتسر کی طرف لوٹل گا۔ اور اگر راستہ میں کہیں 'بودی والا تارا' مجھے سلام کرے گا تو میں اسے بھائی کہہ کر اس سے ایک بار انگلیں منور ہوؤں گا۔"

۳

سنتال لوگوں کے ہاں جو آجکل بہار میں سنتال پرگنہ میں یادہ تر

آباد ہیں، اور جو کسی زمانہ میں خانہ بدوش رہے ہیں، میں دوبار ہوا آیا ہوں بھیلوں اور گوندوں کے جنگل بھی میں نے خوش ہو کر دیکھے ہیں۔ کونڈہ اور ساورہ لوگوں کے پہاڑی علاقے، میں نے اچھی طرح چھان مارے ہیں۔ یہ آب و ہوا اڑیہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اکثر وہاں کا پانی پینے سے باہر کے آدمی کو جھٹ بخار اچھٹتا ہے اور بخار بھی ایسا جو کئی بار دیرینہ سالتی بن جاتا ہے اور آدمی کی جان لے کر ہی آرام پاتا ہے۔

جنگل کے لوگ قدرت کی گود میں بستے ہیں۔ پھول انہیں بہت بھاتے ہیں۔ سنتھال لوگوں کا ایک ہر دل عزیز گیت ہے :

”جنگل میں پھول بہت ہیں
اُن میں یہ ایک کپاس کا پھول بھی ہے
جو پھول پسند ہو چن لو،
جو ناپسند ہو اُسے اُسی کی جگہ پر چھوڑ دو۔“

سنتھال لوگوں کی قدیم زباں زرد روایت بتاتی ہے کہ اپنے مقامِ پیدائش سے یہ لوگ طلوع ہوتے سورج کی طرف منہ کئے صدیوں تک سفر کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے کو سنتھال نہیں کہتے۔ ”سم تھل“ رمیدان میں آنے سے، پڑوسیوں نے انہیں یہ نام دیا۔ اُن کا اپنا قومی لقب ہے ”ہوڑ“۔ یعنی ”آدمی“ یا ”انسان“۔ اُن کا ایک قدیم گیت ہے :

”میرے بھائی بہت ہیں۔“

اُن میں سے ایک کو وہ لوگ پھٹے گئے
 اتنے آدمیوں میں سے ایک کی کمی ہو گئی تو کیا ہوا؟
 پرہائے ایک کے چلے جانے سے ہم سب اُداس ہیں!“
 کاکا کا لیکر صاحب نے اس گیت کی بہت تعریف کی ہے۔ ”کتنا شیر
 جذبہ ہے! کتنا بڑا غلبہ ہے محبت کا! اگر یہ جذبہ ہر جگہ موجود رہتا تو انسان کا
 کھڈا ہوا ہوتا۔“

ایسے گیت میری خانہ بدوشی کو آسان بنائے رکھتے ہیں۔
 میری جڑیں دیہاتی گیتوں کی دھرتی میں گہری چبی گئی ہیں۔ میرا شوق
 سُختہ ہے اور اس شوق کی جڑیں زندہ ہیں اور مضبوط بھی۔ ہمیشہ سڑک بچھ
 سے کھتی ہے۔۔۔ چلو! ابھی اور آگے چلو!

۴

پچھلے آٹھ ماہ سے آندھریش کا چکر لگا رہا ہوں۔
 بہت سے گیت جمع کر چکا ہوں۔ یہاں کے دو گیت تو نہایت دلچسپ
 ہیں۔ (۱) ”اُردا کی نیند“ اور (۲) ”لکشمی ہنس پڑا“ یہ گیت بہت لمبے ہیں
 کی عورتیں ہی اکثر انہیں گاتی ہیں۔ عورتیں خود اپنے گیتوں میں ان دونوں
 گیتوں کو مٹا رہتی ہیں۔

”اُردا کی نیند“ میں رام چند راجی کے بھائی لکشمی کی بیوی کی چودہ سال

بہی نیند فرض کی گئی ہے۔ رامائن میں اُرملا کا ذکر بہت کم آیا ہے۔ سگور نے اپنے ایک مضمون میں 'بہت دن ہوئے' بالیکی کو کوسا تھا کہ کیوں اُنہوں نے بے چاری اُرملا کی تصویر رامائن میں پوری طرح سے نہیں کھینچی۔ لکشن نے رام اودسیتا کے ساتھ واپس اودھیا میں لوٹ کر بھی اپنی بیوی اُرملا کی خبر تک نہ پوچھی تھی، رام کا دربار لگا ہے۔ سیتا شکایت لے کر حاضر ہوتی ہے۔ 'اُرملا چودہ سال سے بڑی سوتی ہے۔ اور لکشن ہے کہ وہ اُسے پوچھنے تک نہیں گیا' رام جیلان رہ جاتے ہیں۔ یہاں سے ہی گیت شروع ہونا ہے۔ پھر لکشن اُرملا کو جا کر جگاتا ہے۔

دوسرے گیت میں لکشن ایک بار رام کے دربار میں ہنس پڑتا ہے۔ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ وہ اُسی کی کسی خامی پر ہنسا ہے۔ سیتا بھی جو رام کے پاس بیٹھی تھی یہی سمجھتی ہے کہ لکشن یہ یاد کر کے کہ میں لکھا میں راون کی قید میں رہی تھی اور آج رام کے پاس بیٹھی ہوں بغیر ہمتی پر بہت شرمندہ ہوئے۔ رام تلوار اٹھا لیتے ہیں، لکشن کو قتل کرنے کے ارادہ سے۔ سیتا ان کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ لکشن بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی کمزوری پر بالکل نہیں بننا۔ جنگل میں نیند کی دیوی اُسے پہلے ہی روز رات کے وقت ملنے آئی تو اس نے کہا تھا کہ آج تو تم جاؤ، چودہ سال نہ سونے کی قسم کھالی ہے میں نے، تم میری بیوی کے پاس جاسکتی ہو میرے پاس تو اس وقت

آناجب میں ایودھیا میں بن باس کے بعد رام کے پاس بیٹھوں اور
چونکہ آج عین وقت پر نیند میری آنکھوں میں آ حاضر ہوئی میں پانی بات
کو یاد کر کے کھلکھلا کر منہں پڑا۔ رام شرمندہ ہوتے ہیں۔ پھر ہم رام کو سوتے
لکشن کے پاؤں دباتے پاتے ہیں۔

کون جانے ان گیتوں نے کب جنم لیا تھا۔

دیہاتی گیتوں میں لوگوں کے دھڑکتے دل اور عظیم الشان ہندوستان
کی جذبات بھری آنکھیں دیکھ کر خانہ بدوشی کا یہ میرا شوق نشہ سے بدل گیا ہے

۵

شروع میں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ عمر اسی شوق کی نذر کر دوں گا
دل کہتا ہے، ابھی بہت عمر باقی ہے۔ مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ
میرا دل اس راستہ سے اُگٹنے کا نہیں۔

اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ میری بیوی اب سفر کی تکلیفوں کی
عادی ہو گئی ہے، وہ میرا ساتھ چھوڑ دے تو میں آج ہی اپنی ناکامی
تسلیم کر لوں۔

وہ کہہ رہی ہے۔ میں خانہ بدوش کی بیوی ہوں۔ میں خوش ہوں۔
اگر میں کبھی دیہاتی گیتوں پر چند کامیاب کتابیں لکھ سکوں گا تو
اُن میں میری بیوی کی ایک خاموش تصویر تو رہے گی ہی۔

میری ڈاک بھی جگہ جگہ ہو کر گھومتی پھرتی مجھ تک پہنچتی ہے۔

ابھی اگلے دن میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کا فوارش نامہ لاہور سے چل کر پورے دو مہینہ بعد مجھے ملا۔ لکھا ہے: ”مجھے اُمید نہیں میرا یہ خط آپ کو مل سکے۔ پھر بھی بھیج رہا ہوں کہ اگر مل جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں آپ کو بھولا نہیں۔ نہ میں نہ ہمایوں۔“

دوستوں کی محبت مجھے زندہ رکھتی ہے، ہائے! ایک بھائی کے چلے جانے سے ہم اُداس ہیں، یہ جذبہ معلوم ہوتا ہے، میرے ایک ایک دوست کے دل میں ہو جاتا ہے۔

میں نے زندگی میں کوئی دولت جمع نہیں کی، ادھر میری نظریاں روپیہ ملے نہ ملے، خانہ بدوش تو محبت کے زور سے کسی نامعلوم کشش سے آگے بڑھتا ہے۔

آزاد کھلی ہوا میرے دل میں بس گئی ہے۔

میں ہوا کے ساتھ اُڑتا ہوں، پھر کبھی کسی دوست کا خط آ جاتا ہے، تو زندگی اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے صرف دوست ہی کئے ہیں۔

”پتا جی! ہم لنکا کب جائیں گے؟“

”چپ بیٹی! ابھی پیسے تو آنے دو کہیں سے!“

”کہاں سے پیسے آئیں گے؟“

میں ہول خانہ بدوش

۲۳۶

"خدا بھیجے گا!"

"ضرور!"

"ہاں ضرور!"

کویتا ہنس رہی ہے۔ اس کی ماں بھی، اور میں بھی۔

نیچراڑ،

فروری ۱۹۵۷ء

لنکا دیں ہے کو لبو

”یہ جگنو ہے، ماں!۔ دُور دیں کا راہی!“ نے بچپن میں جب میں پہلی بار جگنو بچہ کرماں کے پاس لایا تھا، تو ماں نے یہ بات بڑے فخر سے کہی تھی۔

جگنو میری مٹھی میں بند تھا اور انگلیوں کی درمیانی درزوں سے نکلتی ہوئی مدھم جوت بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ضرور کسی دُور دیں کا گیرا ہے۔ اور رات ہوتے ہی کسی جادُو کے اثر سے اپنے ہجولوں سمیت دھڑ چلا آتا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے میں ہرن کے بچے کی طرح آنگن میں کود

رہا تھا۔ اور ماں نے کہا تھا "اے چھوڑ دے، بیٹا! دیکھنا اس کے پنکھ نہ توڑ دینا، اور پیچھے اس کی ماں بے چین نہ ہوتی رہے!"
میں نے جگنکو چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی برسوں تک میں جگنوؤں کے پیچھے بھاگتا رہا، ہاں، یہ ڈر ضرور لگا رہتا کہ کہیں میرا گھرا تنا پیچھے نہ رہ جائے کہ میں راستہ ہی بھول جاؤں۔

کو تلبو میں پہنچ کر مجھے بچپن کے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے ہیں جگنوؤں کے پیچھے دوڑتا ہوا دُور نکل جانے سے ڈرنے والا بچہ بڑا ہو کر اتنی دُور سمندر پار آ پہنچے گا، یہ کون جانتا تھا؟ یہ تو ماں بھی نہ جانتی تھی۔

تاروں کی چھاؤں میں ہم تینوں سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ میں، میری بیوی اور میری بیٹی کویتا۔ دُور تک سڑک چلی گئی ہے، سمندر کے کنارے کنارے۔ غریب مزدور کے جھے ہوئے لہو کی طرح اس کا رنگ کالا ہے۔ اور سڑک کے کنارے یہ فُٹ پاتھ جس پر پڑی ہوئی بیچ پر ہم بیٹھے ہیں، کافی اُبھلا ہوا ہے۔ کسی غمزدہ عورت کی آنکھ کی طرح جو لگانا روکنے سے سُوج گئی ہو۔

سمندر اپنی زبان میں نہ جانے کیا بول رہا ہے۔ اُن گنت صدیوں سے وہ یوں ہی بول رہا ہے۔ دُور سے ایک لہر آتی ہے، سر اٹھائے ہوئے، اور جب تک وہ کنارے سے اُکڑ لکڑائے، زیادہ دُور سے دوسری لہر اٹھتی ہے

جو پہلی لہر سے زیادہ زبردست ہوتی ہے اور سر اٹھائے کنارے کی جانب چل پڑتی ہے۔ اور پھر اُس سے بھی پرے دونوں سے زبردست لہر سر اٹھاتی ہے۔ سمندر کی ان تینوں لہروں کے متعلق لنکا کے لوگ ایک کہانی سناتے ہیں۔ آج بھی یہ لہریں ایک ایک رُوح اپنے کندھوں پر اٹھائے ناچ رہی ہیں۔ ایک نوجوان اپنی بہن کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر اُس کی اتنی تعریف کرنے لگا کہ عورت کی زندگی گزارنے سے اُس کا من اوپ گیا اور اُس نے شرما کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اُسے خود کشی کرتے دیکھ کر بھائی بھی اُس کے پیچھے کود پڑا۔ اور پھر اُن کی ماں بھی اُن کے پیچھے ہوئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ رب سے بڑی لہر پر اُس لڑکی کی رُوح سوار ہے۔ اُس سے چھوٹی لہر پر لڑکے کی رُوح اور اُس سے بھی چھوٹی لہر پر اُن کی رُوح۔ صدیوں سے یہ رُوحیں بقیہ رہیں۔ مگر تینوں لہریں الگ الگ اُٹھتی ہیں اور کنارے سے الگ الگ ٹکراتی ہیں۔ آج تک یہ لہریں ایک دوسرے کو مٹا نہیں سکیں۔

اور کوئٹہ کے اس وسیع سمندر کو دیکھتے ہوئے مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے :

ایک پہاڑی نالا سوچنے لگا کہ اُسے کسی چھوٹی سی برساتی ندی سے نہیں بلکہ خود سمندر کی پیٹی سے شادی کرنی چاہئے۔ وہ گھر سے چل پڑا۔

راستہ میں ایک ندی ملی۔ وہ بولا۔ ”تم کہاں جا رہی ہو؟“
 ”میں اس جانب پچاس کوس کی دوری تک جا رہی ہوں۔“
 ”تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں سمندر کی بیٹی سے شادی
 کرنے جا رہا ہوں۔“

”چلو کچھ دور ہمارا ساتھ ہے۔ راستہ مزے سے کٹے گا۔ آگے چل کر
 میں تمہیں کسی اور بہن کے حوالے کر دوں گی۔“

چلتا چلتا آخر وہ سمندر کے پاس جا پہنچا۔ اور اُسے مخاطب کر کے
 بولا۔ ”میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنے آیا ہوں۔“

”مگر اب تو چوما سے کہ دن ہیں۔ ان دنوں ہمارے یہاں شادی
 کی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ اب جاؤ۔ پھر آنا۔ پھر میں اپنی بیٹی سے
 بھی مشورہ کر لوں گا۔“

نالا چلا گیا۔ کیسے؟ کون جانے؟ اور چوما سے کہ بعد اُس میں اتنا
 پانی ہی نہ رہا کہ وہ سمندر کے پاس پہنچ سکتا۔ اور وہ سمندر کی بیٹی کو صرف
 سینوں ہی میں دیکھتا رہ گیا۔

یہ کہانی میں نے المورے کے ایک پہاڑی کسان کے منہ سے سنی تھی۔
 سمندر کی بیٹی کی صورت کیا سچا پہاڑی دیہات کی کسی سیتا خوبانی
 اور چینیسی سے بھی زیادہ مہنہ تھی؟ ہو کرے۔ میں تو آدمی ہوں، کوئی

پھاڑی نالا نہیں۔ مجھے جو بیوی نصیب ہوئی ہے اور اب میرے ساتھ بیچ پر بیٹھی ہے میرے لئے سمندر کی بیٹی سے کہیں زیادہ حسین ہے۔
”سمندر کی لہریں کیا بول رہی ہیں، پتا جی؟“

”وہ کہہ رہی ہیں کہ کویتا اُن کے ساتھ کھیلے جاؤ کھیلو، بیٹی!“
کویتا چل پڑی ہے۔ فُٹ پاتھ سے نیچے اتر رہی ہے۔ لڑوہ ریشمے ساحل پر چلی گئی۔ وہ دوڑ رہی ہے، عجب انداز سے، جیسے وہ کھانگی ناچ کی مشق کر رہی ہو۔

مگر وہ تو لوٹ رہی ہے۔ جب وہ سمندر کی لہروں سے مل جائے گی تب شاید وہ ہمارے اصرار کرنے پر بھی گھر جانے کا نام نہ لیا کرے۔
کویتا پھر ہمارے ساتھ بیچ پر آ بیٹھی ہے۔ پھیلتی آنکھوں سے کبھی میری بیوی سمندر کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی کویتا کی طرف۔
”کویتا ہمارے سمندر کی لہر ہے۔“
”ہاں!“

اور میرے منہ سے یہ ایک ہی لفظ سن کر میری بیوی کے گالوں پر دی لالی دوڑ رہی ہے جو میں نے بارہ سال پہلے دیکھی تھی جب وہ دہن بنی قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی اُس میں اپنی لمبلی آنکھوں کو دیکھتی تھی اور کبھی آنکھیں سے میری طرف۔

پُرانے قصوں میں کشیر ساگر کی تعریف کے پُل باندھے گئے ہیں۔ مگر کیا وہ سمندر اس سمندر سے بھی خوبصورت ہے، جسے لنکا کی پُرانی تاریخ یاد ہے اور جسے کولمبو کا بچپن تو ہرگز نہ بھولا ہوگا۔ کشیر ساگر میں شیش ناگ نے وشنو بھگوان کے لئے ملائم سچ بنا رکھی ہے۔ وشنو جی لیٹ رہے ہیں لکشمی اُن کی بیوی اُن کے پاؤں دبا رہی ہے۔

خوب تصور ہے۔ ہوا کرے۔ یہ سب دیوتاؤں کی کہانی ہے۔

میں تو آدمی ہوں اور کولمبو میں سمندر کے کنارے اپنی بیوی اور بیٹی سمیت بیچ پر بیٹھا ہوں۔

۲

جب سے میں کولمبو میں آیا ہوں میری غریبی مجھ پر اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ جس مکان میں میں رہتا ہوں اُس کے قریب ہی ایک بکری ہے۔ بکری کا مالک کون جانے میرے متعلق کیا سوچتا رہتا ہے۔
”یہاں نوکری کی تلاش میں آئے ہو بھائی؟“ چند روز پہلے اُس نے سوال کیا تھا۔

اور جب میں نے بتایا کہ میں یہاں لنکا کے دیہاتی گیت جمع کرنے آیا ہوں تو وہ حیران رہ گیا۔

لے دودھ کا سمندر

وہ خود لنکا کا آدمی ہے۔ پتجا بوردھ۔ سنہالی جو اُس کی مادری زبان ہے وہ بڑی روانی کے ساتھ بولتا ہے۔ مگر سنہالی زبان کے دیہاتی گیت اُس نے کبھی نہیں سُنے اور نہ اُن کی اہمیت ہی کبھی اُس پر واضح ہوئی ہے۔ شاید وہ مجھے دیوانہ سمجھتا ہے۔ دیہاتی گیت ہی جمع کرنے تھے تو میں اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لئے کیوں مارا مارا پھرتا ہوں! اور پھر میں نے کوئبو میں ہی کیوں رہائش اختیار کی کسی گاؤں میں جانا چاہئے تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاؤں کہ شروع میں کوئبو میں رہنا ضروری ہے تاکہ یہاں کے ادیبوں کی مدد سے ایسے لوگوں کے پتے مل جائیں جو میرا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

غریبی خانہ بدوش ادیب کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ خفیہ پولیس کی طرح وہ اُس کا استقبال کرنے کے لئے جگہ جگہ کھڑی رہتی ہے۔ اس بیکری کو دیکھتا ہوں تو مجھے سارا کوئبو شہر ایک بڑی بھٹی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس بھٹی میں میں ڈبل روٹی کی طرح سینک جاؤں گا۔ یہ نگوڑی قہمت بھی تو ایک نانبائی ہی ہے۔ صدیوں سے وہ روٹیاں سیکتی آئی ہے۔ کتنا جنچا ہوا ہے اس کا ہاتھ۔ اور گندھے ہوئے آٹے کے گولے بناتی انہیں پھپھوں سے گزارتی، اور انہیں سیکنی، وہ کبھی اُکاتی نہیں۔

”یہی لنکا دیس ہے پتاجی؟“

”ہاں، کویتا!“

کل یہی سوال اس نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ اور اُسے یہی جواب ملا تھا۔
”راون کی لڑکا بھی یہی ہے، پتا چلی؟“

”ہاں، کویتا!“

وہ خاموش ہو گئی۔ کون جانے کل وہ پھر یہی سوال دہرائے، بچپن
میں ہم کہیں ایک ہی سوال بار بار اٹھایا کرتے ہیں؛ ایک بار جواب پا کر
مختصری دیر کے لئے خواہ تسلی ہو ہی جائے مگر سوال برابر قائم رہتا ہے

کہاں ہے راون؟ کہاں ہے اس کی لڑکا کا سونا؟ ہنومان نے
راون کا محل جلا ڈالا تھا مگر اتنا سونا کہاں چلا گیا؟ ہاں تو کیا رامائن کا
راون صرف شاعر بالیکی کے سپنوں سے پیدا ہوا تھا؟ اور کیا شاعر کے
سپنوں کا دھرتی کے ساتھ، دھرتی کی زندگی کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا؟
یہ کسی شاعر کے سپنوں کی لڑکا کا حال نہیں ہے۔

ادھر زندگی کا معیار ہندوستان کی اوسط درجے کی زندگی سے اونچا ہے۔
اُس کی تحلیف جتنی قریب خاندہوش ادیب محسوس کرتا ہے اتنی خاص لڑکا
والوں کو نہیں ہوتی۔ ان کو زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے تو وہ زیادہ کھاتے
بھی تو ہیں۔

شدت کرتے ہوئے انہوں کی طرح خوش پوش جنٹلمین ہر چیز کو گھورتے

ہوئے نکل جاتے نہیں سمندر کے کنارے شام کے وقت آپ بھی آجائیں اور
میشن کو ناک دیکھ لیں۔

کل ہی سٹر سٹوآ کی بیوی اُن سے جا پانی جارجٹ کی ساڑھی کے لئے
روپے مانگ رہی تھی۔ مجھے اپنے ایک بنگالی دوست کی تنگدستی یاد آگئی۔
بہت افسوسناک صورت بنا کر سٹر سٹوآ جی نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کی بیوی
نیا مہینہ چڑھتے ہی کہنے لگتی ہے کہ اسی روز اُس کے لئے نئی ساڑھی آ
جانی چاہئے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ مسز مگر جی ڈھا کہ کی اصلی ریشمی
ساڑھی مانگتی ہے اور مسز سکھ ابدیشی کپڑے کیے سستے پن پر فدا ہے۔
کولمبو میں ہندوستانیوں کی بہت سی دکانیں ہیں۔ بنی سوزی ٹریڈ
اپنی ضرورت کی چیزیں خود خریدنے آتی ہیں۔ بزرگان پر کالی کالی آنچل
اور چمکینے ریشمی بالوں کا مید لگا رہتا ہے۔ ساڑھی کا ٹول پوچھنے والی
نازنیں کی دھیمی، شیریں آواز سن کر سادی وضع کا ہندوستانی کارندہ اپنے
دل میں ایک گدگد سی سی ضرور محسوس کرتا ہوگا مگر اسے یہ سوچنے کی فرصت
کہاں کہ وہ لڑکی ابھی ”مس“ ہے یا ”مسز“ بن چکی ہے۔ یہاں بہو اور بیٹی
کی پوشاک میں وہ ذرا فرق نہیں دیکھتا۔ بوردھ کو لہنیں اپنی مانگ میں
سید ورتاک نہیں لگاتیں۔

”لنکا دیس عجیب ہے جی! ادھر سہاگن اور بہو کی بھی کوئی پہچان نہیں“

”سچ ہے“

”ہے تو آخر راون کی لٹکانا!“

بساطی کی دکان سے یہ آواز آرہی ہے۔ میں منہں رہا ہوں۔ ٹریم چل رہی ہے۔ موڑکاریں! دھرا دھر گھوم رہی ہیں۔ اور پھر بھی یہ راون ہی کی لٹکارہی!

اب میں اتنا غریب نہیں۔ کو کمبو کے اخبارات سے مجھے اپنے مضامین کا معاوضہ ملنے لگا ہے۔ کچھ روپیہ مدراس سے بھی آرہا ہے۔ اب مکان والے کا کارندہ ہمارے یہاں کرایہ لینے آتا ہے تو مجھے اپنے آپ پر غصہ نہیں آتا۔ اس مکان میں بجلی کا بھی عجب انتظام ہے۔ ایک مخصوص خانے میں پچیس سینٹ چرتی اکاسک ڈالنا پڑتا ہے۔ میٹر سے یہ پتہ چلتا رہتا ہے کہ بجلی کتنی باقی ہے۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ یکایک اندھیرا ہو جاتا۔ اور جب کہیں میں چرتی ڈالتا تو روشنی ہوتی۔ اور اب یہ حال ہے کہ میں چاہوں تو ایک وقت میں تین چار سکتے ڈال سکتا ہوں۔

۳

کیا لٹکانی تاریخ میں کوئی راجہ ایسا نہیں گزرا جسے اپنی پٹ رانی سے وہی محبت رہی ہو جو شاہجہاں کو اپنی ملکہ سے تھی؟ کاش! یہاں بھی کسی راجہ نے کوئی مقبرہ بنوایا ہوتا۔ اُسے اپنی بیوی کو دکھاتے

ہوئے میں وہی الفاظ دُہراتا، جو آگرہ میں میری زبان سے نکل پڑے تھے۔
 ”یہ صرف شاہجہاں کا ہدیہ نہیں۔ یہ مرد کا ہدیہ ہے عورت کی خدمت میں۔“ اس
 وقت مجھے اپنی غریبی بھُول گئی تھی۔ میں بھی ایک شاہجہان تھا، اور میری
 بیوی ایک ممتاز محل !

سُورج نکلنے سے پیشتر سمندر کے کنارے کھڑا ہونا بڑی خوش قسمتی
 ہے۔ پہلے اُشا کے گالوں پر وہ لالی نظر آتی ہے جو پہلی بار دولہا کے
 سامنے آنے پر شرمیلی دُھن کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے اور پھر یہ لالی
 دھیرے دھیرے غائب ہو جاتی ہے۔

خود میں نے ہی للچائی ہوئی نظروں سے ہزار بار سُورج بھگوان کو اپنے
 سونے کے رتھ پر سوار ہوتے دیکھا ہے۔ اور ہر بار مجھے یہ رتھ نیا ہی معلوم
 ہوا۔ مگر کو لمبو کے ساحل پر یہ رتھ اور بھی نیا اور چمکیلا معلوم ہوتا ہے۔
 میں کہتا ہوں ”راون کی لنکا کا کارا سونا کہیں سُورج بھگوان کے
 رتھ پر تو نہیں خرچ ہو گیا۔“

اور میری بیوی کہتی ہے ”اجی واہ! یہ رتھ تو پُرانا ہے، سینکڑوں
 راوَنوں سے پہلے کا ہے۔“

کل شام شاعر ٹیگور کا ایک خیال مجھے بہت گدہا رہا تھا:
 ”شام کے دھندلکے میں سب چیزیں جھُوت پریت بن جاتی ہیں۔“

ہیناروں کے بچھے حصے اندھیرے میں کھو گئے ہیں یس اشا کی راد
دیکھوں گا اور جاگ کر تیرے شہر کا درشن کروں گا؟

— اب صبح کی روشنی میں سوچتا ہوں کہ کہیں شاعر نے یہ نغمہ کو لبوں
بچھے کر تو نہ لکھا تھا۔

شاعر کبھی آسمان کو دیکھتا ہے اور کبھی بے کنار سمندر کی طرف، جس کے
آئینے میں سورج ہمیشہ سے اپنا منہ دیکھتا آیا ہے۔

”تیری زبان کیا ہے، او سمندر؟“

”ابدی سوال کی زبان!“

”تیرا جواب کونسی زبان ہے، آؤ آسمان؟“

”ابدی خاموشی کی زبان!“ (ریگور)

سمندر کی لہریں ناچ رہی ہیں، جنوبی ہند کی دیو اسیوں کی طرح۔
ان لہروں کو کس دیوتا کی پوجا کا شوق ہے؟ اس سائل پر شو کی مورتی
تو دکھائی نہیں دیتی۔

۴

رامائن میں لکھا ہے کہ راوَن شو کی پوجا کیا کرتا تھا۔

اور بُدھ کی لنگا میں بھی شو کا بنیا کندے سوامی — جسے ہندو

پُراؤن میں کارتیکے کہا گیا ہے — عام لوگوں کے دلوں پر برابر

راج کر رہا ہے۔

کندے سوامی کے معنی ہیں ”پھاڑ کا مالک“ پہلے یہ دیوتا تین چوٹیوں والے پہاڑ پر رہتا تھا۔ ایک دن وہ نیچے دریا کے اُس پار جانے کے لئے، جہاں درختوں کا جھڑیٹ نظر آ رہا تھا، ہتھ پھیرا ہو گیا۔ تب وہ صرف تامل لوگوں کا دیوتا تھا۔

ایک دن ادھر سے کچھ تامل گزرے اور دیوتا بولا ”اے اچھے لوگو! مجھے دریا کے اُس پار لے چلو۔“

”مگر ہم تک جمع کرنے چاہتے ہیں، او اچھے دیوتا! دیر ہو گئی تو بارش آجائے گی! اور سارا تک ٹھل جائے گا۔“ وہ چلتے بنے۔ اور دیوتا راض ہو گیا۔

پھر ادھر سے کچھ سنہالی گزرے، تو دیوتا نے اپنی خواہش اُدھرائی۔ وہ اُسے نیچے لے گئے۔ اور دیوتا خوش ہو گیا۔

کندے سوامی نے یہ بردان دیا کہ آئندہ صرف سنہالی نسل میں سے ہی اس کا بڑا بیٹھاری چُنا جائے گا۔ آج تک یہ بردان اٹل ہے۔ اس دیوتا کے بڑے مندر میں بولنگا کے جذب مشرقی حصے میں کتر گام میں واقع ہے۔ سنہالی بیٹھاری چلا آتا ہے۔

کوئٹہ میں بھی، جہاں مختلف نسلوں کے تین لاکھ آدمی بستے ہیں

کندے سوانی کے بھگت بل جائیں گے۔ تاہل لوگ اُسے ”سُبرِ میتم“ کہتے ہیں۔ جب دھرتی پر دیوتاؤں اور اسروں میں ٹیڈہ ہوا اٹھا، دیوتاؤں کی فوج کو اسی نے لڑائی کے گر سمجھائے تھے۔ وہ مور کی سواری کرتا ہے، اور جنگ کا دیوتا ہے!

کل ٹریم میں ایک بودھ بھکشو سے ملاقات ہو گئی۔ پتہ چلا کہ وہ گوشت نہیں کھاتا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ خود بُدھ بھگوان میرے سامنے بیٹھے ہیں۔

”اہنسا کے قائل اور اس پر بھی گوشت خور!“ میں نے کہا ”آپ لنکا والوں کو سمجھاتے کیوں نہیں؟“

وہ صرف مسکرایا۔ اور میں نے سوچا کہ خود بُدھ بھگوان بھی اسی طرح مسکراتے ہوں گے، اور پاس کی نشست سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اُبل اُٹھا۔ ”ہم بازار سے گوشت خریدتے ہیں، خود کسی جاندار کو نہیں مارتے اور کھانے کو تو ہم کسی بھی طرح کے گوشت سے پرہیز نہیں کرتے۔“ بودھ بھکشو کو میں نے منسکار کیا۔ وہ پھر مسکرایا۔ اور وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ہنس رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ اُس نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔

ٹریم سے اتر کر میں جے، و جے تنگ کے یہاں جا پہنچا۔ وہ بولے

”آئیے، آئیے۔“

اپنے گھر کے سامنے وہ گھاس پر ٹہل رہے تھے۔ ننگے پاؤں۔ اپنی کتاب کا نام رکھتے وقت بھی وہ اسے جھولے نہیں۔ خوبصورت نام ہے ”میرے قدموں کے لئے گھاس“۔

میں نے کہا ”اپنے گاؤں کے لوگوں کو آپ نے چھوٹی نندی پر مچھلی پڑتے دکھایا ہے۔ آپ کی کتاب میں یہ بات پڑھتے وقت میں حیران رہ گیا۔“

وہ ہنسنے لگے اور جھینپ سے گئے۔

”اور آپ نے اسے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔“

”اجی میں نے کچھ جھوٹ نہیں لکھا۔ سب سچ لکھا ہے۔ ایک ہمارے ہی گاؤں میں نہیں، دوسرے دیہات میں بھی عورتیں رات کا بچا کھچا بھات نندی میں لاگاتی ہیں۔ مچھلیاں اسے کھانے کے لئے لپکتی ہیں۔ ایک ایک کوئی عورت ایسی چالاکی سے اُلٹی ہانڈی مچھلیوں کے اوپر پھینک کر باہر نکالتی ہے کہ اس میں چند مچھلیاں رسوئی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے آ پھنستی ہیں!“

”تو آپ اسے ٹھیک سمجھتے ہیں؟“

”اب یہ میں کیسے کہوں؟“ وہ کچھ جھینپ سے گئے۔

اپنی کتابیں انہوں نے لکھا ہے ”مجھنی پچھنے کا یہ طریقہ ایک طرح سے دوستی اور اہنسا کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ مچھلیاں جو روز رات کا بچا بھات کھاتی ہیں، باری باری سے آدمی کی رسوائی کے لئے پھڑکی جائیں تو کوئی پاپ ٹھوڑا ہی ہے۔“

مذہب کے ساتھ آدمی کا یہ مذاق بہت پُرانا ہے۔

۵

اُس کی آواز بنسری کے سرسوں سے بل کر رہی ہے۔ یہ گاڑیاں گاؤں کا آدمی ہے۔ گو لمبو کی سڑک پر پہنچ کر بھی اُس نے اپنے گاؤں کو بھلا نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ کسی پٹنے سے ابھی جاگا ہے۔

وہ گاربا ہے :

”تاریکی میں جھگنوا ڈر رہے تھے۔“

اُن کے پروں سے ٹٹٹاتی روشنی آرہی تھی۔
اور کسی کی مصموم سی مٹھی آواز میرے کان تک پہنچی !
اجی تم اُس کے دھیان میں اتنا کیا سوچنے لگے ہو ؟“

صرف گاؤں کی کسی کنواری کی آواز ہی گاڑیاں کے کان تک پہنچی اور اُسے گھماٹل کر گئی۔ پیار صرف روپ دیکھ کر ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اپنے گیتوں میں گاڑیاں اپنے بیلوں کو بھی نہیں جھوٹا :

”دوسروں کا پیٹ پالنے کی خاطر تم خود کو کھاتے ہو۔“

دن رات کام کرتے ہو۔ مار سکتے ہو۔

درد کی ٹیڈیس برداشت کرتے ہو۔

اوسے اوہیل اکتے ہی آدمی تو منجھ سے بھی کم وقت رکھتے ہیں۔

مگر کوئلو شہر کی فضا میں دیہاتی سنگیت کی آواز بہت اجنبی معلوم

تی ہے۔ لاریوں کے ڈرائیور چھکڑے کو دیکھتے ہیں تو ہنس دیتے ہیں۔

ٹیبان لاری کا بارن سنا ہے تو سہم جاتا ہے۔ وہ بھی اور اُس کے

ساتھی۔

سناٹا گیتوں کے سرسری زبان پر چڑھ رہے ہیں۔ ہر رات میں

یہ گیلے کھیتوں کی سوندھی سوندھی ہلک بھیل جاتی ہے اسی طرح ہر ملک

کے سنگیت کی تانیں ہم تک پہنچتی ہیں اور ہمیں اپنا دلدادہ بنا لیتی ہیں۔

کچھ دیہاتی گیت تو مجھے کوئلو میں ہی چند ادیبوں سے مل گئے ہیں۔ اب

لنکا کے مختلف حصوں میں پہنچوں گا۔

اور جب مجھے لنکا کو الوداع کہہ کر ہندوستان کو ٹن پڑے گا تو میں ٹیگور کے

”ب لٹھے میں“ دینا کے بجائے لنکا ”بدل کر پکار اٹھوں گا۔“

”اے میرے لنکا! میں تیرے ساحل پر اجنبی کی طرح آیا۔

میں تیرے گھر میں مہمان بن کر رہا۔“

اور اب میں تیرے دروازے سے
دوست بن کر رخصت ہوتا ہوں۔

”یہ راون کی لنکا ہے یا بُدھ بھگوان کی؟“
”دولوں کی، کویتا!“
”سچ مچ؟“

”سچ مچ!۔۔۔ اور اس سے بھی سچ تو یہ ہے کہ لنکا تنہا ہی بھی ہے،
تنہا ہی ماما کی بھی، اور میری بھی!“

ہم تینوں خوش ہیں۔ میں، میری بیوی اور میری بیٹی کویتا۔
سامنے بے کنار سمندر اپنے ابدی رقص میں محو ہے۔ یہ سڑک جو کنا
کنارے چلی گئی ہے اور جس کا رنگ غریب مزدور کے جیسے ہوئے لہو کی طرح
کالا ہے، کولمبو کے تین لاکھ باشندوں ہی کی نہیں، ہماری خوشی کی بھی
امانت دار ہے۔ سڑک ہی نہیں، یہ فُت پانچ بھی، جو بدستور ابھرا ہوا ہے
۔۔۔ غمزدہ عورت کی آنکھ کی طرح جو لگاتار رونے سے سُوج گئی ہو۔

جنگلی کبوتر

ماں کی گود کی طرح یہ گاؤں بار بار مجھے بلاتا ہے۔ آدمی کی طرح
 گاؤں کی جہنم پتھری بنانے کا رواج ہوتا تو نہ صرف میں اس کی وجہ
 تسمیہ دریافت کر سکتا، بلکہ اس کی عمر کا بھی ٹھیک ٹھیک پتہ چلا لیتا۔
 نام ہے بھدوڑ۔ اور یہ لفظ میرے لئے ایک گتھئی سے کم نہیں۔
 ہاں جہاں تک اس کی عمر کا تعلق ہے، یہ گاؤں، جیسا کہ روایت سے
 ظاہر ہے، ہماری ریاست کی راجدھانی پٹیلہ سے بھی کہیں پہلے آباد
 ہوا تھا۔

چاروں طرف۔ کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ ان میں سے
میں تھوڑے سے گاؤں ہی اب تک دیکھ پایا ہوں۔ باقی گاؤں دیکھنے
کا ارادہ ضرور ہے۔ کون جانے کب ایسا کر سکوں۔ اس کماری تک
چکر لگا آیا۔ اس سے بھی پرے لنکا میں بھی گھوم پھر آیا۔ مگر اس کے
یہ گاؤں میری نگاہ سے پرے رہے!

یہاں میں نے جنم لیا۔ میرے سینوں میں جو درجہ اسے حاصل ہے
وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ گاؤں ہمیشہ
کے لئے مجھے جبر نہیں دے سکتا۔

ماں کہتی ہے: ”دیو! تم آتے بعد میں ہوا در جانے کی رٹ پہنے
ہی لگانے لگتے ہو!“ بیوی کہتی ہے: ”اب تو میں چند ماہ یہاں اپنی ساس
کی خدمت کروں گی۔“ ضرور!“ میں جواب دیتا ہوں اور میری بیوی کا
سارا حُسن اُس کی کالی مدھماقی آنکھوں میں ناچ اٹھتا ہے۔ مگر اندر
سے وہ خوب جانتی ہے کہ نہ جانے بچہ ایک کس دن اس سے میرے ہمراہ کسی
نئے سفر پر چلنا پڑے۔

اُس آزاد پنچھی کی طرح جو آسمان کی وسعتوں کا دورہ کرنے کے بعد
پھر دھرتی پر اترتا ہے، میں بار بار یہاں چلا آتا ہوں۔ کسی نئے طبعی کشش
کے زیر اثر۔ زندگی کے شروع کے تیرہ سال اسی گاؤں میں گزرے

تھے۔ میں اس کی نبض پہچانتا ہوں۔ کتنی ہی دُور کیوں نہ نکل جاؤں
اس کا تصور میرے دماغ میں برابر بندھا رہتا ہے۔

دُور دُور جدھر بھی نگاہ اٹھتی ہے۔ کھیت لہلہا رہے ہیں ساری
دھرتی مجھے جانتی ہے، جیسے میری اپنی ماں جس کی گود میں پلا
ہوں، میری رگ رگ سے واقف ہے۔ اس ماحول میں ماضی اور
مستقبل گھل مل کر حال میں بدل جاتے ہیں۔

پُرانی کہانیاں یہاں اب بھی شوق سے سُنی جاتی ہیں۔ گیتوں
کو بھی وہی پہلا دخل حاصل ہے۔ یہ کہانیاں ان لوگوں سے
چھین لی جائیں، یا یہ گیت کسی طرح ان کے پاس نہ رہیں، تو
ان کی زندگی پر کیسی مُردنی چھا جائے۔

غُربت بھی ہے، اور افسردگی بھی۔ مگر دل کو خوش کرنے
والے پُرانے افسانے اور گیت بھی تو ہیں۔ — بھٹکن اُتار دینے
والے، ڈالوال ڈول روحوں کو خود فراموشی کے عالم میں لے جانے
والے۔ یہ افسانے اور گیت ماضی کے بیٹے ہیں، اور مستقبل کے
امانت دار۔

سُنے جاؤ، اور سنا لے جاؤ اپنے افسانے، دھرتی کے مٹیو، اور
گاسے جاؤ اپنے گیت پُرانے اور نئے۔

وہ سُرخ و سفید گول مہتابی چہرہ، وہ میرے دادا کا جھڑپوں والا چہرہ اب کہاں! ایک صدی کے لگ بھگ اُن کی عمر اسی گاؤں میں کٹ گئی۔ پرانی روایتوں کی تو وہ گویا ایک کان تھے ”دھرتی ہم سب کی ماں ہے، اسے صرف سطحی انداز سے ہی نہ دیکھتے رہنا۔ اس کے دل کی دھڑکن سننا اور جو یہ کہے اُسے ماننا“ اُن کی یہ نصیحت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔

چاند اب بھی چمکتا ہے اور کھیت اپنے سینے کھولے پڑے رہتے ہیں، امرت بھری کرلوں کو دھیرے دھیرے اپنے اندر جذب کئے جاتے ہیں! دھرتی کے بیٹے یہ نظارہ دیکھتے ہیں، تو وہ زندگی کا سب درد اور کرب یک لحوت بھول جاتے ہیں۔ چاندنی میں اپ مدھ ماتی کیفیت ہوتی ہے۔ کھیت تو کھیت، بیابان اور ریتیلے میدان بھی چاندنی میں اپنے اندر کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، جیسے ایک بڑھیا، جو بظاہر عمر رسیدہ گائے کی طرح دُودھ نہ دے سکنے کی وجہ سے بے کار ہو گئی ہو، اپنے بیٹے کی بہو کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر اپنی جوانی کی یاد میں کھوجاتی ہے۔

بہار اب بھی آتی ہے اور بہار کا وہ پُرانا نغمہ، جو صدیوں سے دلوں کی سیر کرتا ہم تک پہنچا ہے، اپنے الفاظ میں آج بھی وہی

جادو لئے ہوئے ہے :

”کدے بول وے نمانیاں کاواں !

کوئلاں کوک دیاں !

اے ارے او حقیر تو سے ! کبھی تو بھی بول۔ کوئلیں تو کوک ہی ہیں۔
 کوک کی زالی، نازک اور سیلی کوک کہہ رہی ہے۔ بہا رہی گئی !
 جس کا محبوب پردیس میں ہے وہ بہار کا استقبال کیسے کرے ! مگر کوئل کیا
 جانے برہن کا درد ! اُس کی کوک مسلسل ہے۔ برہن حقیر تو سے سے اس
 کی کانیں کانیں کا مطالبہ کرتی ہے۔ صدیوں سے کوئل بولتا آیا ہے اور آج
 بھی جب وہ منڈیر پر بیٹھ کر اپنی کانیں کانیں شروع کرتا ہے، کانڈوں
 کی عورت کہہ اٹھتی ہے ”آج کوئی مہمان آئے گا ! اور کون جانے یہ مہمان
 برہن کا سا جن ہی ہو۔ اور کوئل کے متعلق عورتوں کا خیال ہے کہ وہ خود
 ایک برہن ہے اور ہجر کی آگ میں تل کر ہی وہ کالی ہو گئی ہے۔

پرندے یقیناً آدمی سے بہت پہلے پیدا ہوئے ہوں گے پہلے
 پرندوں کے پیٹھے بول سن کر آدمی کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی ہوگی۔ کچھ
 پرندے تو اُس کے چچوچی دوست بن گئے۔ سوچتا ہوں کوئل کی کوک میں
 کیا پہلے روز بھی ایسا ہی درد و گداز تھا ! اور کیا تو سے کی کرخت کانیں

کانہیں میں پہلے روز بھی کوئی مٹھاس نہ تھی؛ مگر ہائے! کہتے ہی پرندوں کو تو آدمی نے اپنی خوراک میں شامل کر لیا۔

چھٹپن سے ہی کبوتر کے لئے میرے دل میں ایک خاص کشش رہی ہے۔ ہمارے گھر کے عین سامنے ایک کبوتر باز رہتا ہے۔ ذات کا بیراگی اور کام کبوتر بازی۔ اُس کا یہ شوق اب بھی قائم ہے۔ لیکن اب شاید اُس کے پاس زیادہ پیسے نہیں آتے، ورنہ آج بھی اُس کے یہاں کبوتروں کی اتنی ہی تعداد ہوتی جتنی میں اپنے بچپن میں ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔

ابھی تک یہ کبوتر باز کنوارا ہی ہے اور اب کون بیراگی اُسے اپنی لڑکی دے گا؟ یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اُس کی بیوی ہمیشہ جان کو رویا کرتی۔

اب تو خیر مجھے یہ کبوتر باز زیادہ نہیں بھاتا، پر بچپن کے دن میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ گھر والوں کی آنکھ بچا کر اُس کی چھت پر میں مٹھیاں بکھیر کے باجرہ پھینکتا رہتا تا کہ مُفلس بیراگی کے کبوتر بھوک سے نہ زو پا کریں۔

جب وہ اڑتے کبوتروں کو لدکارتا اور پھر اُنہیں واپس بلانے کے لئے ہاؤ ہاؤ کرتا، میں سوچتا اکاش میں بھی ایک کبوتر ہوتا، پتھا ہے تو اچھا۔

اُس کی آواز میں وہ تعریف شکلتی تھی، جو مدرسے کا اُستاد بھی اپنے ہوشیار شاگرد کے کانوں میں نہیں پڑنے دیتا۔ اور کبوتر بھی اُس کی آواز پر ناپتا نظر آتا۔

میرا تخیل اُدپر آسمان کی طرف اُڑتا، کبوتروں کے ساتھ ساتھ، دُور بہت دُور۔ کبوتر بادلوں کو چھوتے دکھائی دیتے۔ گھر کا تصور ان کے دلوں میں برابر بندھا رہتا، اُن کے مالک کا بشاش چہرہ اُن کی آنکھوں میں بھرتا رہتا اور وہ سب کے سب اُس عشق بازی کی وہ گھڑیاں یاد کیا کرتے جو کہ مالک کا دل خوش کرنے کے بعد، آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں کی سیر کرنے کے بعد انہیں نصیب ہوتیں۔

اس کبوتر بازیراگی کا نام ہے رانجھا۔ آپ اس نام کی دلکشی سے بالکل انکار نہیں کر سکتے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ ہمارے کہانی کار رانجھا بھینس چرایا کرتا تھا اور وہ بھی چند رکھی ”میر“ کی جسے وہ اپنی محبوبہ بنا چکا تھا۔ اور ہمارا یہ پڑوسی کبوتر اُڑایا کرتا ہے۔ وہ بھی اپنے، اور اُسے کسی ہیرے بیاہ کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ہیرے کے محبوب رانجھے نے بارہ سال تک اُس کی بھینس چرائی تھیں۔ اس پر بھی ہیرے کی شادی رانجھے سے نہ ہو پائی تو رانجھے کی خوشی اُداسی بن گئی۔ اور ہمارا یہ پڑوسی رانجھا پورے پچیس سال سے کبوتر پال رہا ہے۔ آج وہ اپنی کبوتر بازی کی ”سلور جوبلی“ منا سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ خوش رہا ہے۔

اس رانجھے کی ماں نے اپنی ایک پڑوسن کو بیٹی کی گالی دی تھی اور اُس نے جل جھن کر کہہ دیا تھا ”تیرا بیٹا کبوتر باز نکلے گا!“ مجھے یہ خبر

ایک بڑھیا برہمنی سے ملی ہے۔ کون تھی وہ پڑوسن جس کی پیشین گوئی اتنی سچی نکلی، رانجھے کی ڈھیلی پگڑی دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کیا یہ بھی کسی بڑھیا کی بددعا کا اثر ہے!

’پنچا ہے تو اچھا!‘ — وہ کہہ رہا ہے۔ کبھی کبوتر کی چونچ کی طرف بغور دیکھتا ہے۔ کبھی اس کا سینہ پکڑتا ہے اور پھر جب کبوتر پھڑپھڑاتا ہے تو اس کی گردن سامنے کی طرف جھک جاتی ہے اور وہ اپنی آنکھیں کبوتر کی آنکھوں میں گاڑ دیتا ہے۔ کبوتر دیکھتا ہے کہ اس کے مالک کی آنکھوں میں پیار کا ہی نہیں، رحم کا بھی ایک بے کنار سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کبوتر دل ہی دل میں مست ہوا اٹھتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی لالی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ لال لال ڈوروں میں شفق کا سارا حُسن ناچنے لگتا ہے، اور اس کی آنکھوں کی وہ سفیدی، جو ارے میں کنائے کنارے نظر آتی ہے۔ اپنے اندر پہاڑی شہر کی سی شیرینی لئے رہتی ہے کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کیا وہ سونے چلا ہے اپنے مالک کے نرم باعقوں میں، جیسے درودھ پیتا بچہ مال کی گرد میں سو جاتا ہے۔

جب میں کسی کبوتر کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی دیکھتا ہوں تو مجھے آدمی کی بے رحمی پر بہت غصہ آتا ہے۔

حافظ کے ان الفاظ کو یاد کر کے جو اس نے کعبہ کی چھت پر بیٹھے

کسی آزاد کبوتر کو مخاطب کر کے لکھے تھے، میرا دل تڑپ اٹھتا ہے:

”تو اے کبوترِ بامِ حرمِ چمِ دانی

طہیدِ دلِ مرغانِ رشتہ برپارا!

— اے حرم کی چھت پر بیٹھنے والے کبوتر! اُن پرندوں کے دل

کے پھڑپھڑانے کو ٹوک لیا جانے جن کے پاؤں میں رستی بندھی ہوئی ہے!

سُنوں میں بھی جنگلی کبوتر کا خیال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ادھر

جنگلی کبوتروں کی بھولاہٹ ہے۔ باہر کھیتوں میں نکل جاتا ہوں تو شام کے

گرد و غبار سے میلے بادلوں میں تیز رفتار سے اُڑنے والے کبوتر۔

میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اُڑتے اُڑتے وہ اُفق میں غائب

ہو جاتے ہیں، جہاں بادلوں کی سُرخِ اُنہیں ڈھانپ لیتی ہے کھیتوں

سے کوٹتے ہوئے کسان اور مزدور شام کی پُرسکون فضا میں آزاد جنگلی

کبوتروں کی پرواز دیکھ کر اپنی صدیوں سے چھپی ہوئی راحت کو واپس

لانے کی جستجو میں کھو جاتے ہیں۔ . . . کتنے بے فکر ہیں یہ پرندے، وہ

سوچتے ہیں — کسان مزدور سے کہیں زیادہ بے فکر!

کبھی کبھی کوئی شکاری بھی مل جاتا ہے، اور اُس کے پاس مرے

ہوئے جنگلی کبوتر دیکھ کر اُن کی بے بسی کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

سوچتا ہوں ظالم کی بندوق چھین کر چکنا چور کر دوں۔ وہ شکاری میری

زبردستی سے بگڑ کر اسی بندوق سے مجھے بھی کبوتر کی طرح موت کے گھاٹ اتار دے، یہ ڈر کچھ نہیں کرنے دیتا۔

پالتو کبوتر غلام تو ہے مگر اسے کسی شکاری کی بندوق اپنا نشانہ نہیں بناتی۔ وہ جنگلی کبوتر سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ پالتو کبوتروں کی شاہانہ بردباری، خود فراموشی اور پرسکون طبیعت کے بالمقابل جنگلی کبوتروں کی لاپرواہی پر نہیں جی جان سے قربان ہو سکتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی لاپرواہی انہیں زیادہ عمر نہیں پانے دیتی۔

راجھا کہتا ہے ”اگر خدا مجھے کبوتر کا جنم دینے پر رضامند ہو جائے۔ تو میں ”لکا“ کبوتر بننا پسند کروں۔“ پالتو کبوتروں میں ”لکا“ کی اپنی جگہ ہے وہ بہت اڑتا نہیں مگر نفاست میں دوسرے کبوتروں پر بازی لے جاتا ہے۔ پر پھیلانے اور گردن اکڑا کر وہ اپنے مالک کا من موہ لیتا ہے۔ گون تو نیچے کی طرف اس طرح موڑتا ہے کہ وہ پیچھے کے پروں کو چھوتی نظر آتی ہے۔

میں کہتا ہوں ”خدا مجھے پرندہ بنا دینے پر رضامند ہو جائے تو بلاشبہ میں جنگلی کبوتر کی چند روزہ آزاد زندگی پانا پسند کروں گا۔“

بیراگیوں کے ڈیرے میں جو راجھے کی جدی جایداد ہے، پیل کا ایک بوڑھا پیڑ کھڑا ہے۔ پاس ہی جاگیرداروں کی حویلی کے کھنڈر اپنی بربادی

دختہ حالی کا افسانہ سنانے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں۔ اس جوبلی میں بیسمل جنگلی کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں اور اس پیل پر بھی جھوٹے بھٹکے کبوترین بصرے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

پالتو کبوتروں کی کابکس جنہیں رانجھے نے بڑی خوبصورتی سے تیار کروایا ہے، زیادہ دُور نہیں، ان کبوتروں کے کئی رنگ ہیں۔ کوئی سفید ہے تو کوئی چمکبرا، کوئی میٹالا ہے تو کوئی سیاہی مائل۔

مگر جنگلی کبوتر خاکستری رنگ کے ہی ہوتے ہیں۔

۳

شروع میں شاید سبھی کبوتر جنگلی تھے۔ شاید کیوں، ضرور۔

چرخہ کاتنے والی دوشیزہ اپنے محبوب کی جادو بھری نگاہوں میں جنگلی کبوتر کی سی حرکت دیکھ لیتی ہے۔ صدیوں سے گھاؤں کی لڑائی اس تشبیہ میں بشارت کی جھلک پیدا کرتی رہی ہے:

”جنگلی کبوتر نے“

مینوں تنجن وچ اکھ ماری!

”میں چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں چرخہ کات رہی تھی، جنگلی کبوتر نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا!“

جنگلی کبوتر نے

میرے ہتھی دے دندگن لے
 ے جنگلی کبوتر نے میرے دانت گن لئے جبکہ میں منہں رہی تھی!
 اور جب یہ کبوتر جانے لگتا ہے تو گاؤں کی لڑکی کہہ اٹھتی ہے:
 ”ایٹھوں مارا ڈاری“

بکھر جاویں گا؟
 ے یہاں سے اُڑ کر کہاں جائے گا تو؟
 کبھی یہ کبوتر اپنے سسرال میں بھی جانا لگتا ہے!
 ”سَس نول ہوانی پچھو دا“
 کدوں بھیجی کبوتری میری؟

ے ساس سے داماد پوچھ رہا ہے۔ میری کبوتری کو (میرے ہمراہ)
 کب بھیجی گی؟

بچپن کی سہیلیاں دُھن کو چھیڑتی ہیں:
 ”دھنیے بدام رنٹھے“
 تینوں لین کبوتر آیا۔

ے اوبادام کی ہمرنگ دھنی! تجھے لینے کے لئے کبوتر یہاں
 آ نکلا ہے!

یہ حق ہے کہ جنگلی کبوتر جلد ہاتھ نہیں آتے۔ اسی لئے وہ ”گوئے“

کہلاتے ہیں۔ نٹ کھٹ! اور اُن کے بالمقابل پالنتو کبوتر ”بیبے“ کہلاتے ہیں۔۔۔ اچھے! :

”ایہ جنگلی کبوتر گولے

تازی ماریاں اُڈ جاندے!“

۔ بڑے نٹ کھٹ ہیں یہ جنگلی کبوتر، ہاتھ سے تالی مارتے ہی وہ

اُڑ جاتے ہیں!“

بھاوج اپنی نند کا راز کھول دیتی ہے۔

”موہ لیا کبوتر گولا

نند کو اسی نے؟“

۔ ”میری کنواری نند نے نٹ کھٹ کبوتر کا من موہ لیا!“

اور نند خود اپنے کبوتر کی تعریف کے پُل باندھنے لگتی ہے :

”روہی دا کبوتر گولا

دھپ دھپ چھاں من دا!“

۔ ”بھرتی کا شریر کبوتر دھوپ میں چھاؤں ماپتا ہے۔“

گھاؤں کی لڑکی خود بھی کسی کبوتری سے کم نہیں :

”پتھی اڈ گئی کبوتری بن کے

ہریاں کنکاں چوں!“

”گیہوں کے سرسبز کھیتوں میں لچھی کبوتری بن کر اڑ گئی!“
گیہوں کی بالیاں لچھی کی پریم کہانی سنا سکتی ہیں۔ کھیتوں کی
رومانی کیفیت نے بار بار دیہاتی شاعری کو گدگدایا ہے۔ گیہوں کے
کھیت آج بھی پیارا اور خوشی سے لہلہا رہے ہیں۔

مرد عورت کا ملاپ، پیار کا جذبہ، حُسن کی کھوج، کالی مدھ ماتی
آنکھوں کی ہیرا پھیری، جوانی کی شوخی اور زندہ دلی — ایسے نظارے
دیہاتی کہانیوں اور گیتوں میں ہمیشہ مقبول ہوئے ہیں۔

کسان کی بیٹی، جس نے اپنا گندمی رنگ شاید اپنے باپ کے
کھیتوں کے گیہوں سے حاصل کیا ہے، اور جس کے گال آسمان کے
آزاد کبوتر کو کیچنے لینے کا دم رکھتے ہیں، دھرتی کی شاعری کو ہمیشہ زندہ
رکھے گی۔ صدیوں سے وہ گاتی آئی ہے:

”باری دہچ بیٹھی ہوئی دی

چُجی لے گیا کبوتر بن کے“

”میں کھڑکی میں بیٹھی تھی، اس نے کبوتر بن کر میرا منہ چوم لیا۔

ایک جرمن کہادت ہے ”میں بوسہ بازی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

جبکہ میں خود اس میں حصہ نہیں لے رہی ہوتی۔“ کیا ہمارے یہ کسان

لڑکی بھی اپنے کبوتر کا منہ چوم لینا چاہتی ہے؟

انہی کی لڑکی اپنی پڑانی کہاوت میں کہتی ہے ”مجھے چوم لے پلوپ
تجھے معاف کر دے گا؛ مجھے چومرا اور میں بھی تمہیں چوموں گی، اور پلوپ ہم دونوں
کو معاف کر دے گا!“ ہماری یہ کسان لڑکی اس سلسلے میں کیا جذبہ
پیش کرنا چاہتی ہے؛

ہاں، مجھے یاد ہے وہ گیت جس نے حال ہی میں جنم لیا ہے
اور کھیتوں میں بڑے شوق سے گایا جاتا ہے:
”آج دے شقین منڈے

کھنڈ بھٹک کے باگیاں لیندے!“

— آج کل کے شوقین نوجوان محبوبہ کے رخساروں پر کھانڈ لگا کر
بوسے لیا کرتے ہیں!“

طنز نے اپنی حد کو چھو لیا ہے۔ از خود بوسہ بازی میں آج کے لڑکے کچھ
مٹھاس نہیں پاتے! کون جانے گاؤں کے اس کبوتر کو بھی، جو کھڑکی
میں بیٹھی کسان لڑکی کا بوسہ لے گیا، کچھ مٹھاس معلوم ہوئی یا نہیں۔ اُسے
شاید ابھی تک محبوبہ کے رخساروں پر کھانڈ لگانے کی ضرورت نہیں پڑی!
راجھا بیراگی کبوتر اڑاتا اڑاتا خود ایک کبوتر نہیں بن گیا، یہ میں کیسے
کہہ سکتا ہوں۔ اپنی سب سے خوبصورت کبوتری کو جو اب پانچ بچوں کی
ماں ہے، وہ ہیر کہہ کر اپنا جسنی لطف کچھ کچھ پورا کر لیتا ہے۔ اور وہ

گنگناتا ہے :

”تیری ہک تے آہنا پایا

جنگلی کبوتر نے!“

— تیرے سینے پر جنگلی کبوتر نے گھونسا لانا لیا ہے!“

جنگلی کبوتر ہے یا خود کام دیوتا؟ — رانجھا بیراگی یہی سوچ رہا ہے۔

ادھر جنگلی کبوتروں کی بھڑار ہے۔ بابکھیتوں میں نکل جانا ہوں تو شام کے گرد و غبار

سے میلے بادلوں میں تیز رفتار سے اُڑنے والے کبوتر میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

کھیتوں سے کوٹتے ہوئے کسان اور مزدور شام کی پرسکون فضا میں آزاد پنچھپیاں

کی پرواز دیکھ کر اپنی صدیوں سے چھپی ہوئی راحت کو لوہے کی کڑیوں میں کھاتے ہیں۔

جنگلی کبوتر کی طرح جو آسمان کی ہستوں کا دورہ کرنے کے بعد پھر دھرتی پر اترتا ہے

میں بار بار یہاں چلا آتا ہوں یہ ساری دھرتی مجھے جانتی ہے۔ یہاں میں نے پنہ لیا میرے

پٹنوں میں جو درجہ اسے حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ اور

بات ہے کہ یہ گاؤں ہمیشہ کے لئے مجھے جکڑ نہیں سکتا۔

غربت بھی ہے اور افسردگی بھی۔ مگر دل کو خوش کرنے والے گیت بھی تو ہیں۔

مستکن اتار دینے والے ڈالوائے ول روحوں کو خود فراموشی کے عالم میں لے جانے والے۔

یہ گیت ماضی کے بیٹے ہیں اور مستقبل کے امانت دار۔ سُنے جاؤ اور گائے جاؤ اپنے گیت

پڑانے اور سننے، دھرتی کے بیٹو!

